جلد ۸۱ | ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۷ء | شمارہ - ۹، ۱۰

اس شمارے میں

ناشر: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام (لاہور) یو ایس اے

پتہ: ۱۳۱۵ کنگز گیٹ روڈ، کولمبس، اوہائیو ۱۵۰۴- ۴۳۲۲۱ (یو ایس اے)

انتہائی مبارک خوشخبری

قرآن مجید کا روسی زبان میں ترجمہ شائع ہو گیا

نہایت محترم بہن ثمینہ ساہو خان کا حضرت امیر کو امریکہ سے فون

مرتبہ: ناصر احمد

ہماری جوان ہمت بہن محترمہ ثمینہ ساہو خان صاحبہ نے امریکہ سے حضرت امیر ڈاکٹر اصغر حمید صاحب کو فون پر یہ خوشخبری سنائی کہ خدا کے خاص فضل و کرم اور احباب جماعت کی دعاؤں اور مالی اعانت سے حضرت مولانا محمد علی مرحوم و مغفور کا انگریزی ترجمہ روسی زبان میں منتقل ہو کر شائع ہو گیا ہے۔ اس عظیم الشان کام کی تکمیل پر جہاں محترمہ بہن ثمینہ ساہو خان اور امریکہ جماعت کے فعال ممبران مبارک کے مستحق ہیں وہاں روسی زبان میں قرآن مجید کے ترجمہ کی اشاعت سے تحریک احمدیت' لاہور کی تاریخ میں سنہرے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ روسی زبان میں ترجمہ کی اشاعت کے ذریعہ حضرت مولانا محمد علی مرحوم و مغفور کے فہم قرآن کی روشنی اب مغربی دنیا سے پرے ان ملکوں میں بسنے والے لوگوں کے ذہن و عمل کو جلا بخشے گی جو اب تک الحاد اور بربریت کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا یہ شاہکار قلم اب قرآن مجید کی معرفت اور سنت رسول اکرم صلعم کی عملی روشنی کو زار روس کی سنگلاخ سرزمین میں خدا شناسی اور انسانی اقدار کے بیج بوئے گا۔ امید ہے کہ سالانہ دعائیہ کے موقع پر احباب جماعت روسی زبان کے اس ترجمہ کی جھلک دیکھ سکیں گے۔

روسی ترجمۃ القرآن کے متعلق مزید تفصیلات

چند روز ہوئے امریکہ جماعت کا تفصیلی خبرنامہ "بشارات احمدیہ" جو سال میں دو مرتبہ شائع ہوتا ہے اس کا جولائی کا شمارہ ہمیں موصول ہوا ہے جس میں روسی زبان میں قرآن مجید کے ترجمہ سے متعلق مترجم کا پیش لفظ اور دیگر تفصیلات درج کی گئیں ہیں۔ ذیل میں ان کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

FRONT COVER OF THE RUSSIAN TRANSLATION OF THE HOLY QURAN

СВЯЩЕННЫЙ КОРАН

в переводе, с введением и с комментариями
МАУЛАНЫ МУХАММАДА АЛИ

پیش لفظ از ناشرین

قرآن مجید کا روسی زبان میں ترجمہ کا کام ۱۹۸۹ء میں شروع ہوا۔ یہ تجویز ہمارے نائب صدر محترم شیخ میاں عمر فاروق صاحب کی طرف سے آئی تھی۔ اس وقت چونکہ روس میں اشتراکی حکومت تھی اور وہاں مذہبی لٹریچر کی اشاعت اور تقسیم پر پابندی تھی اس لئے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ جب روسی ترجمہ شائع ہو گا تو اس کو کس طرح روسی زبان بولنے والوں میں پھیلایا جائے گا۔ اس لئے یہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ کیوں نہ اس رقم کو کسی اور زبان میں قرآن مجید کے ترجمہ پر

(بقیہ: بر صفحہ ۲ اندرونی ٹائٹل)

دو قومی نظریہ کی حمایت میں "لائٹ" اخبار کا ایک اہم اداریہ۔ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء

ترجمہ: ممتاز احمد باجوہ

ہندوستان کی دو قومیں

مولانا محمد یعقوب خاں صاحب مرحوم

بمبئی میں ایک تقریر کے دوران مسٹر جناح کے اس اظہار رائے سے کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں یہ پریشان کن مسئلہ ایک دفعہ پھر سامنے آگیا ہے۔ اپنے بیان میں انہوں نے کہا:

"دونوں قوموں کے تمدن اس قدر مختلف ہیں کہ جو بھی فریق اقتدار میں ہوتا ہے وہ طبعاً" دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے ملک میں جو کہ مختلف قوموں پر مشتمل ہو ایک جمہوری پارلیمانی حکومت ناممکنات میں سے ہے!"

اب یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی ہندوستانی خواہ وہ ہندو ہو، مسلمان ہو یا عیسائی دیانتداری سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ بات افسوسناک ہے اور ہندوستان کی ترقی کے راستہ میں حائل بھی ہو سکتی ہے۔ بہرحال یہ بات بطور ایک تلخ حقیقت کے وجود رکھتی ہے اور کوئی بھی مدبر جو ہندوستان کے لئے نظام حکومت تجویز کرنے کا بیڑا اٹھائے، اس حقیقت کو نظرانداز کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگیاں دو بالکل مختلف دھاروں میں بہتی ہیں۔ چاہے وہ دیوار بادیوار ہمسائے ہی کیوں نہ ہوں پھر بھی وہ ایک دوسرے سے دنیا کی کسی دو قوموں سے زیادہ دور ہوتے ہیں۔ کپلنگ نے جو کچھ مشرق اور مغرب کے متعلق کہا تھا وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاملہ میں اور بھی زیادہ سچ ہے۔ یہ حقیقت اتنی ظاہر ہے کہ اسے کسی مزید توضیح کی ضرورت نہیں۔ ان کے طرز معاشرت کے درمیان خلیج کا اندازہ اس معمولی مگر اہم حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ہندو کسی مسلمان کے چھو جانے کو بھی بھرشٹ ہونا سمجھتا ہے۔ اس کا مذہب اور تربیت ہی ایسی ہے کہ وہ مسلمان کے لمس سے کراہت کرتا ہے اور جونہی کسی کھانے کی چیز کو مسلمان کا ہاتھ لگ جائے وہ ہندو کے لئے فوراً نجس اور ناپاک ہو جاتی ہے۔ ملک کے طول و عرض میں ہزاروں ریلوے سٹیشنوں پر "ہندو پانی" اور "مسلمان پانی" کی آوازیں گویا روزانہ اس بات کا اعلان کرتی ہیں کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں جو ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ایک دوسرے کے جگ سے پانی تک نہیں پی سکتی۔ یہ علیحدگی پسندی، چاہے اسے نفرت نہ بھی کہئے، ہر شعبہ زندگی میں اثرانداز ہے۔ اس حقیقت کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم ہے روزمرہ کی زندگی کے تلخ حقائق کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ ہندو حالات کی اس حقیقت سے بے خبر نہیں۔ مگر اس کے لئے ایک جمہوری آئین کے تحت ایک مشترک قومیت ایک منافع بخش سودا ہے۔ وہ تو ایک اکثریتی جماعت ہے اور جمہوری حکومت کا مطلب اکثریت کی حکومت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سیاسی پلیٹ فارم یا اخباروں میں باواز بلند اپنے اس مسلمان کو جس کا روزمرہ کی زندگی میں اسے چھو جانا بھی ایک قابل نفرت پلیدگی ہے اپنا ہم وطن قومی بھائی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ آٹھ کروڑ اچھوتوں کے لئے جو اس نے حال ہی میں خیر خواہی کی امنگ اپنے اندر محسوس کی ہے--- وہ اچھوت جن کو وہ صدیوں سے اپنے پاؤں کے نیچے مسلتا رہا ہے اور وہ بھی اپنے مذہب کی اجازت سے--- اس خیر خواہی کے پس پردہ بھی یہی امر محرک تھا۔ جب اچھوتوں اور دوسری نیچ ذاتوں کو ایک علیحدہ کمیونٹی کے طور پر شمار کرنے کی تجویز پیش ہوئی

تو ہندوؤں نے شور مچا کر زمین آسمان ایک کر دیا۔ اگر آٹھ کروڑ اچھوت علیحدہ کر دیئے جائیں تو ہندو قوم اپنی اکثریت کھو بیٹھے گی۔ اسی سے ہندوؤں کی تشویش کا پتہ چلتا ہے کہ کیوں وہ ان لوگوں کو اپنے مذہب میں ضرور شامل رکھنا چاہتے ہیں گو جن کو وہ اپنے کے مندر کی دہلیز پر ایک قدم بھی اندر آنے کی اجازت نہیں دیتے اور جن کے کانوں میں اگر وید کے الفاظ چلے جائیں تو پگھلا ہوا سیسہ کان میں ڈالنے کی ہدایت ہے' اسی طرح وہ مسلمانوں پر ایک مشترکہ قومیت مسلط کرنا چاہتے جن کا ہلکا سا لمس بھی وہ ایک پلیدگی اور نجاست سمجھتے ہیں۔ ایک مشترکہ قومیت کا مطلب ہو گا مسلمان اقلیت پر ان کا مکمل تسلط! مہاتما گاندھی کی ہریجن تحریک اور مشترکہ قومیت کا نعرہ جسے کانگرس بڑے ترنگ سے پیش کر رہی ہے ان دونوں باتوں میں سیاسی طاقت کے لحاظ سے ان کے لئے ایک واضح فائدہ ہوگا۔ پہلا امر تو اس لئے ضروری ہے کہ اس سے ہندو کمیونٹی اپنی اکثریتی کمیونٹی کی حیثیت برقرار رکھ سکے اور دوسرا امر اس لئے ضروری ہے کہ تاکہ اکثریت کی حکومت یقینی بنائی جا سکے۔ پہلے امر کی پشت پر انسان دوستی کا اور دوسرے امر کی پشت پر حب الوطنی کا ٹھپہ جو لگایا جاتا ہے یہ محض ایک پارسائی کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش ہے۔ دراصل ہندو بالادستی کے کھیل میں ہریجن اور مسلمان محض پیادے ہیں' پہلا ہندوؤں کو اکثریت دلواتا ہے اور دوسرا انہیں اکثریت کی حکومت! مسٹر جناح کے اس اعلان کو کہ ہندوستان کے لئے جمہوری نظام حکومت موزوں نہیں۔ بہت سے مخالفانہ تبصروں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ لاہور کے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں لکھتے ہوئے ایک ہندو نامہ نگار ایسے دلائل پیش کرتا ہے جو بدیہی طور پر لغو ہیں۔ وہ مسٹر جناح کو یاد دلاتا ہے کہ انہوں نے اپنے ایک حالیہ بیان میں موجودہ آئین پر جس میں گورنر جنرل کے ہاتھ میں ہٹلر سے بھی زیادہ اختیارات دیئے گئے ہیں کڑی نکتہ چینی کی تھی کہ یہ ایک غیر جمہوری آئین ہے۔ وہ سوال اٹھاتا ہے کہ اب ساتھ ہی کس طرح مسٹر جناح جمہوریت کو ہندوستان کے لئے غیر موزوں ہونے کا اعلان کر رہے ہیں؟ اس سے مسلمانوں کے نقطۂ نظر پر ہندو نکتہ چینی کا نہ صرف کھوکھلا پن ظاہر کرتی ہے بلکہ یہ بھی کہ وہ اس میں مخلص نہیں ہیں۔ مسٹر جناح کا قطعاً" یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ گورنر جنرل سے ہٹلرانہ اختیارات چھین کر ایک مستقل ہندو اکثریت کے حوالہ کر دیں اور چونکہ ہندو کمیونٹی اس بات پر تلی ہوئی ہے کہ وہ ان عامرانہ اختیارات پر مسلمانوں کو نظرانداز کر کے اپنی مذہبی اجارہ داری قائم کر لے اس لئے مسٹر جناح ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جیسے وہ انگریزوں کے خلاف اٹھے۔ ان کا موقف بالکل یکساں اور غیر متناقض ہے! وہ کسی کا تسلط نہیں چاہتے خواہ وہ گورنر جنرل ہو یا ہندو اکثریت ہو۔ یہ نام نہاد جمہوریت دراصل کوئی جمہوریت نہیں ہے کیونکہ یہ مسلمان پر ہندو کے تسلط کو دوام بخشتی ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کا مسٹر جناح مقابلہ کر رہے ہیں! نامہ نگار کی دوسری دلیل بھی اتنی ہی بودی اور مضحکہ خیز ہے۔ وہ مسٹر جناح کو کہتے ہیں کہ وہ تمام زندگی تو کانگریس کے ممبر رہے اور کانگریس تو ہمیشہ جمہوریت پر یقین رکھتی تھی تو اب وہ کیسے جمہوریت کو مطعون کر سکتے ہیں؟ نامہ نگار اپنے اٹھائے ہوئے نکتے کے دوسرے رخ سے بڑے مزے سے آنکھیں موند لیتا ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ اب مسٹر جناح کو کانگرس کی اصلیت پتہ چل گئی ہے وہ بہت عرصہ کانگرس کے اندر رہ چکے ہیں۔ کانگرس سے ان کے لمبے عرصہ پر پھیلے ہوئے روابط کی وجہ سے انہیں یقین آ گیا ہے کہ اگرچہ کانگرس جمہوریت کا پرچار کرتی ہے مگر جمہوریت سے مراد ان کے نزدیک ہندو تسلط ہے اور اسی لئے انہوں نے کانگرس سے اپنا راستہ جدا کر لیا۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بھی تو کسی زمانہ میں کانگریس کے صف اول کے لیڈر تھے اور انہوں نے کانگرس کے جھنڈے تلے ملک کی آزادی کی لڑائی لڑی مگر جب انہوں نے دیکھ لیا کہ جس آزادی کے لئے وہ لڑ رہے ہیں اس آزادی کا مطلب صرف ہندو کمیونٹی کی آزادی ہو گا اور صرف برطانوی غلبے کو ہندو غلبے سے بدل دیا جانا ہو گا تو انہوں نے کانگرس کو خدا حافظ کہہ دیا۔

یہی ہے وہ مایوس کن اور تلخ حقیقت جس کو جان لینے کے بعد مسٹر جناح کو بھی جو کہ کانگرس کے سابق صدر بھی ہیں کانگرس کے خلاف کھڑا کر دیا ہے۔ یہ نامہ نگار مزید بیان کرتا ہے کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہب کا کوئی اتنا خاص اثر باقی نہیں رہا تو پھر ہندوستان کو مذہبی گروہوں کی بنیاد پر کیوں تقسیم کیا جائے؟ گو سچ ہے کہ مذہب کی گرفت کم ہو رہی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ مذہبی تعصبات روز بروز شدید تر ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید ماضی میں کبھی بھی ذبیحہ گاؤ پر اتنی خونریزی نہیں ہوئی جتنی آج کل ہو رہی ہے۔ اب تو ایسے بھی ہندو ہیں جو اب گائے کو مقدس نہیں سمجھتے۔ ایسے بھی ہیں جو کبھی کبھار گائے کے کبابوں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی مسلمان اس کی چہیتی گائے کو ذبح کرے تو یہی آزاد خیال ہندو اس کا خون کرنا چاہیں گے۔ مذہب خواہ موجود نہ ہو مگر مذہبی منافرت موجود ہے۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ مذہبی منافرت کبھی بھی اتنی تشدد آمیز نہ تھی جتنی آج ہے اور جوں جوں ہندوستان کے لوگوں کو حکومتی اختیارات منتقل ہو رہے ہیں، یہ نفرت کے شعلے تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ نامہ نگار اس دن کی آس لگائے بیٹھا ہے جبکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زندگیاں سائنس کے زیر اثر آجائیں گی اور ایک نیا کلچر، ایک سائنسی کلچر جو کہ عام بنی نوع انسان میں مشترک ہو گا، وجود میں آجائے گا۔ ہمیں اس جانب بھی کوئی زیادہ امید نظر نہیں آتی۔ بایں ہمہ گو یورپین اقوام اس وقت ایک سائنسی تہذیب کے دور سے گزر رہی ہیں مگر پھر بھی جرمنوں اور فرانسیسیوں کے درمیان کون سی محبت ہے؟ ہر سائنسی پیش قدمی ان کے درمیان تلخی کو بڑھا رہی ہے۔ سائنس ہمیں مادے کی تسخیر تو سکھا سکتی ہے مگر اپنے نفس کی تسخیر نہیں سکھا سکتی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس انسان کے نفس کو اور بھی بے لگام کر دیتی ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ سائنس اور سائنسی کلچر کا دور ہندو مسلم کشمکش کو اور بھی شدید کر دے۔ بہرحال یہ سب کچھ آئندہ کے پردہ میں چھپا ہوا ہے کہ کیسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی مفاہمت صرف آج کے معروضی حالات کی بنیاد پر ہو سکتی ہے اور ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مسٹر جناح یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ قومیں ہیں اور پارلیمانی طرز حکومت جو کہ ایک مشترکہ قومیت، ایک مشترکہ زبان اور ایک مشترکہ کلچر کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے، ناممکنات میں سے ہے۔

ہاں یہ ایک الگ سوال ہے کہ پارلیمانی طرز حکومت کا سب سے اچھا بدل کیا ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ تو ماننا پڑے گا کہ خواہ انسان ہندوستان میں ایک مشترکہ قومیت کی کتنی بھی خواہش کرے فی الحال ایسی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔ صاف صاف بات تو یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں جن کے مفادات اتنے ہی متصادم ہیں جتنے کہ دنیا کی کسی بھی دو قوموں کے ہو سکتے ہیں۔

تاوقتیکہ موجودہ تعصبات ختم نہ ہو جائیں اور جب تک کہ ایک مشترکہ قومیت کا خیال ہندوستانی ذہن میں راسخ نہیں ہو جاتا اکثریتی حکومت کا موجودہ نظام صحیح طریق پر نہیں چل سکتا۔ اس کا مطلب لازماً یہ ہو گا کہ مسلم اقلیت ہمیشہ کے لئے ہندو اکثریت کے زیر تسلط آجائے گی۔ مسٹر جناح نے یہ کہہ کر ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات کی بالکل صحیح ترجمانی کی ہے کہ ایسا نظام ناممکنات میں سے ہے اور مسلمان قوم کبھی بھی اس سے اتفاق نہیں کرے گی۔ ہندو کمیونٹی جتنی بھی جلدی اس حقیقت کو مان لے اتنا ہی بہتر ہو گا۔ سیاست میں بھی ایمانداری اتنی ہی بہترین پالیسی ہے جتنی کہ بزنس میں۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ موجودہ فرقہ وارانہ تلخی کا بیشتر حصہ ہندوؤں کے اس حقیقت کے انکار کی وجہ سے ہے۔ اس حقیقت کو صاف صاف تسلیم کرنا کہ ہندوستان کے مسلمان بذات خود ایک قوم ہیں، دونوں قوموں کے درمیان ایک بہتر مفاہمت کی راہ ہموار کر دے گا اور ایک دو طرفہ خیر سگالی اور احترام کے ماحول میں موجودہ نظام حکومت کے لئے کوئی متبادل ایسا نظام تلاش کیا جا سکتا ہے جو کہ دونوں قوموں کے مفادات کو تحفظ فراہم کر سکے۔

ایک روسی عالم الیگزینڈر سیڈ سکی کا حضرت مولانا محمد علی صاحب کو خراج تحسین

مترجم: محترم پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم

میں نے آج سے تقریباً ایک سال پہلے مولانا محمد علی کی تصنیفات کا مطالعہ شروع کیا۔ ان میں مختصر، جامع، مربوط اور عام فہم انداز میں آپ نے دین متین کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس نے جلد ہی مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا کیونکہ جو بات بارہ تیرہ صفحات میں بیان کی جا سکتی تھی وہ آپ نے چند الفاظ میں بیان کر دی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کتب کے مطالعہ کا مزید شوق میرے دل میں اس لئے بھی پیدا ہوا کہ مولانا محمد علی صاحب اور تحریک احمدیت (جماعت احمدیہ لاہور) سے تعلق رکھنے والے دیگر علماء اور مفکرین نے اپنے لٹریچر میں جن نہایت اہم مسائل پر بحث کی ہے ان میں اور اس زمانے کو درپیش نہایت پیچیدہ اور دقیق مسائل میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس وقت دنیا ان درپیش مسائل کے ایسے حل کی متلاشی ہے جو مذہب کو وحدت نسل انسانی کے نقطہ نظر سے پیش کرے تاکہ دنیا میں انسان دوستی کے نظریات اور جذبات کو فروغ حاصل ہو سکے۔ مثلاً آج کا انسان ایسی سچائی کی تلاش میں ہے جو ظاہر اور باطن، پائیدار اور ناپائیدار یا فانی اور غیر فانی کے درمیان جو تضاد پایا جاتا ہے اسے دور کر دے۔ افلاطون، ہیگل اور ٹالسٹائی کے پیش کردہ فلسفہ میں بھی ہمیں یہی مسئلہ فیصلہ کن دکھائی دیتا ہے۔ مولانا محمد علی صاحب بھی اسی سچائی کی تہہ تک رسائی کی جستجو میں کوشاں نظر آتے ہیں اور میرے لئے یہ بات قطعاً" حیرت کا باعث نہیں کیونکہ احمدی مصنفین اس حق کو پانے کے لئے دین کے اس تصور کی طرف رجوع کی دعوت دیتے ہیں جس کی بنیاد جذبہ بین الاقوامیت، رواداری اور اپنے مدمقابل کے ساتھ دیانتدارانہ اور مخلصانہ باہمی تبادلہ خیال پر آمادگی پر ہے۔ یہ بلاشبہ رجوع کی دعوت ہے یعنی اس حقیقی دین اور اس کے بنیاد محکم اصولوں کی طرف لوٹ آنے کی دعوت ہے جو ایسے گھٹیا اور مفاد پرستانہ نظریات کے جبر سے پاک ہیں جنہیں مذہب کے نام پر معاشی اور سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر اور مذہبی جنون کو اقتدار حاصل کرنے کے لئے بطور ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے۔

اگر اس بحث کا پوری دیانت داری کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو یہ سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ تحریک احمدیت کے لٹریچر میں دین متین کو نہایت دیانتداری، صاف گوئی اور وسعت نظر کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا محمد علی صاحب کو اللہ تعالیٰ کی توحید کا اتنا گہرا ٹھوس، عالمگیر اور ہمہ گیر ادراک حاصل ہے کہ قاری اللہ تعالیٰ کی جستجو میں ان کی بے قراری اور اضطراب کو بڑی آسانی سے بھانپ لیتا ہے اور یہ جان لیتا ہے کہ اپنے اردگرد محیط دنیا کی حقیقت اور اس میں انسان کے کردار کو سمجھنے کی دیانت دارانہ کوشش اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ اس کو ایسے معنی پہنائے اور اس میں ان اقدار کو تلاش کرنے کی کوشش کرے جو اس کے وجود اور اس کے اندر کارفرما قوانین کا تعین کرتی ہے۔ انسان کے اندر خود آگہی کی قوت، سائنسی نظریات اور انبیاء کی پیشگوئیاں یہ سب ایک ہی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں کہ یہ کائنات ایسے جدا جدا عناصر پر مشتمل نہیں جو اپنی اپنی ذات میں ہر لحاظ سے کامل ہوں۔ ان سب سے اعلیٰ اور ارفع ایک اور قوت یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کامل ہے جو انہیں باہم پیوست کر کے ہمارے سامنے حقیقت کا روپ بخشتی ہے۔ الہامی بصیرت روزمرہ زندگی میں واقع ہونے والے نادرالعقل تجربات استغراق و مراقبہ کی کیفیات سب اللہ تعالیٰ کی ہستی کامل پر دلالت کرتے ہیں۔ وہ اپنی کمال مہربانی اور فضل سے ہمارے اندر امید کا ایک چراغ روشن کرتا ہے کہ ایک نہ ایک دن ہمیں اس کی صفات کاملہ کی نوعیت اور ماہیت کا ادراک حاصل ہو جائے اور اس طرح دریافت ہونے والی حقیقت ہم پر روشن ہو جائے گی۔ جب زندگی کا کامل مفہوم معروضی طور پر ہم پر منکشف ہو جائے گا تو لوگوں کو شے اور اس کے نام اور مادہ اور تصور

کے درمیان جو بظاہر گہرا اختلاف نظر آتا ہے وہ اسے دور کرنے پر قادر ہو جائیں گے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو انسانی تہذیب و ثقافت اور ہمارے اردگرد کی دنیا ظاہری تفاوت کے باوصف اصل میں ایک ہی تصویر کے مختلف رخ نظر آتے ہیں جن میں تقدیر الٰہی کے مطابق یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ مولانا محمد علی صاحب جو فلسفہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اس میں یکسانیت اور ہم آہنگی کا موضوع ان کے نزیک اس قدر اہم اور لازمی ہے کہ وہ جب بھی کسی چیز کی ماہیت پر قلم اٹھاتے ہیں تو اول اس کے اخلاقی پہلو پر نظر ڈالتے ہیں اور اس کے بعد قدرتی طور پر ان کی توجہ اس عقلی اور جمالیاتی اہمیت کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر کلام پاک کی اخلاقی تعلیم نے انسانوں کے تعلقات پر جو زبردست اثر ڈالا ہے اس کا بنظر غائر تجزیہ کرنے کے بعد مولانا محمد علی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کلام پاک ایک بے نظیر اور منفرد حیثیت کی حامل کتاب ہے اس کے بعد اس کے جمالی رنگ کی طرف آتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کا طرز بیان' آیات کی ترکیب و ترتیب' شعریت اور موسیقیت کی دلفریبی اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔ ان تمام باتوں پر اگر یکجا طور پر غور کیا جائے تو یہ مصنف (مولانا محمد علی) کی حیرت انگیز علمی فضیلت' تجزیہ کی گہرائی اور غیر معمولی وسعت نظر پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہیں اس سے بھی زیادہ اہم ایک اور بات یہ ہے کہ ایک خدا کے منکر کو بھی کلام پاک کی اخلاقی' علمی اور جمالیاتی خصوصیات انفرادی طور پر مکمل نظر آئیں گی اور اس پر ایمان لانے والے کو یہ ایک ہی حقیقت کہ جو مجسم صداقت ہے کے مختلف پہلو دکھائی دیں گے۔ مولانا محمد علی صاحب نے توحید الٰہی پر جو سیر حاصل بحث کی ہے اس سے بھی دل میں یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے دین متین کی جو تشریح کی ہے وہ عالمگیر نوعیت کی ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ ان کی تحریرات کا یہی وہ پہلو ہے جو ان میں قوت کشش اور جادو کی سی تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔ مولانا محمد علی نے معانی و مفاہیم کا جو ایک متحرک اور قوت آفریں نظام پیش کیا ہے انہوں نے اس کی بنیاد بھی توحید الٰہی پر رکھی ہے جو اس کائنات کے ہر ذرے میں کارفرما ہے۔ تحریک احمدیت کے اس مصنف کی فکری گہرائی و گیرائی نے انہیں اس عظیم مقام پر کھڑا کر دیا ہے جس کی عظمت کے اعتراف کے لئے ان کے لٹریچر کا مطالعہ اب ناگزیر ہو گیا ہے کیونکہ اب ایک دوسرے کے نظریات کو سمجھنے اور قبول کرنے کا یہی ایک ذریعہ ہے جس سے انسانی فہم و ادراک اور ذہنی ارتقاء کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

مولانا محمد علی صاحب کے نزدیک ہماری تہذیب و تمدن کی جو اساسی اقدار ہیں وہ دراصل ایک ہی حقیقت یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کے ہی مختلف عکس ہیں جو اجزا کی طرح سب مل کر کل میں فنا ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مستجمع جمیع صفات کاملہ ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں (جیسے سفید روشنی کے سات مختلف رنگ آپس میں مل کر سفید روشنی پیدا کرتے ہیں۔ مترجم)۔ اسی وجہ سے مولانا محمد علی صاحب اپنے اس نظریے پر بار بار زور دیتے ہیں کہ دین متین کسی ایک قوم کا نہیں بلکہ ساری نسل انسانی کا مذہب ہے۔ مذہب کے بارے میں ان کا یہ بین الاقوامی نقطہ نظر نہ صرف ان کے اعلیٰ و ارفع مقاصد کی عکاسی کرتا ہے بلکہ کل کائنات کے متعلق وحدانیت کے تصور کو بھی اجاگر کرتا ہے جس سے ہر شے کے فی ذاتہٖ کامل ہونے کے نظریہ کی بھی نفی ہوتی ہے۔ یہی بات دین متین کے اس اہم ترین اصول کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے کہ تمام انبیاء پر ایمان لانا لازمی ہے۔ انبیاء بنی اسرائیل اور حضرت عیسیٰؑ کی وحی کو سچا تسلیم کرنے کی یہ وجہ نہیں کہ دین متین رواداری کی تعلیم دیتا ہے جسے احمدی علماء اور مفکرین اپنے لٹریچر میں بار بار دہراتے ہیں بلکہ ان کے نظریہ توحید کے مطابق تمام انبیاء کی وحی ایک ہی ذات حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رہنمائی کرتی ہے جو مستجمع جمیع صفات کاملہ ہے۔ دنیا کی جن زبانوں میں وقتاً" فوقتاً" یہ وحی نازل ہوتی رہی ہے اس میں ذات اولیٰ یا صداقت حقیقی کے لئے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا ایک ہی مطلب اور مفہوم ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ انسانی قبائل کے درمیان تعلقات اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کی طرف آنے والے انبیاء کے پیغامات کے درمیان ایک ایسی یکسانیت نظر آتی ہے جو تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانی معاشرہ کی ہر سطح پر ذہنی اور اخلاقی ارتقا کے ساتھ ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے۔ جب مولانا محمد علی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اب کلام پاک ہی وہ واحد بے نظیر کتاب ہے جو تمام قوموں اور آئندہ زمانوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہے تو اسی موضوع پر (اللہ تعالیٰ کی توحید) ان کی توجہ مرکوز رہتی ہے۔ کلام پاک اس لحاظ سے بھی ایک لاثانی کتاب ہے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں جو کامل آہنگی کارفرما نظر آتی ہے یہ اس کی عکاسی کرتا ہے دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے رب العالمین ہونے کا عقیدہ بھی توحید الٰہی پر ہی ایمان لانے کا نتیجہ ہے اور مولانا محمد علی صاحب نے دنیا کی مختلف قوموں کے درمیان معاشرتی تعلقات کی جو تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے وہ بھی اسی تصور (توحید الٰہی) کا

منطقی نتیجہ ہے۔ مولانا محمد علی صاحب نے جن کلیدی معاشرتی تصورات کا تجزیہ پیش کیا ہے اس سے نہ صرف دینی اخوت' دینی حکومت یا دین میں صدقات و خیرات کی نوعیت اور اہمیت پر بلکہ اجتماعی عبادات پر بھی روشنی پڑتی ہے جو گو وقتی طور پر ہی سہی طبقاتی تفریق کے نظریہ کو ختم کر دیتی ہیں۔ مولانا محمد علی صاحب نے جس اصلی دینی معاشرہ کی تصویر ہمارے سامنے رکھی ہے وہ کامل مساوات کا مظہر اور ہر قسم کے استحصال' طبقاتی تقسیم اور اختلافات سے پاک معاشرہ ہے۔ دینی معاشرہ کی یہ تمام خوبیاں اس نظریہ کے مختلف پہلو ہیں جو معاشرہ کو طبقات میں تقسیم کرنے سے انکاری ہے اور جس کے نزدیک قوم ایسے مختلف گروہوں کے مجموعے کا نام نہیں جن کے معاشی اور سیاسی مفادات ایک دوسرے سے متصادم ہوں۔ اس قسم کی طبقاتی تقسیم کا اس لئے یکسر انکار کیا جاتا ہے کہ یہ کلیت کے اصول کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کی توحید کے تصور کے منافی ہے۔

اسی طرح ان کی تحریرات میں مرد اور عورت کے درمیان مساوات کا ذکر بھی بہت واضح اور نمایاں ہے۔ وہ اس موضوع پر اظہار خیال اس لئے نہیں کرتے کہ مذہبی دنیا میں عورت کے ساتھ مرد کے رویے پر جو غیروں کی طرف سے تنقید کی جاتی ہے اس کا جواب دینا چاہتے ہیں۔ بلکہ مصنف کے ہاں اس مساوات کا جو بنیادی تصور ہے اس میں معاشی قانون اور اس سے اہم تر روحانی مساوات شامل ہے اس مساوات کا انکار کر دینے سے دین متین میں مردوں اور عورتوں کے لئے ان اقدار کے دو مختلف نظام تسلیم کرنے پڑتے ہیں مگر ایسے نظریہ کے لئے جو توحید کے رنگ میں رنگین ہے یہ دوہرا معیار قطعاً ناقابل فہم ہے۔ دین متین مسلسل اور بڑی سختی کے ساتھ اس نظریئے کی تردید کرتا ہے کہ چونکہ یہ عالم ایک مجموعہ اضداد ہے اس لئے اس میں پائے جانے والے تضادات کبھی ختم نہیں ہوں گے اور نہ یہ ایک کامل نمونہ کی صورت میں جس میں ہم آہنگی اور یکسانیت پائی جاتی ہو ہمارے سامنے آ سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی فعل اور اس کے نتیجہ یا عمل اور اس کی جزا کے درمیان کوئی تعرض نظر آئے تو اسے اس طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ اس نتیجہ اور صلہ کو براہ راست اس فعل اور عمل کا نتیجہ اور اس کی پیداوار سمجھا جائے۔ عقیدہ توحید سے وابستگی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی اور آخرت ایک ہی حقیقت کے دو مختلف اظہار ہیں۔

مولانا محمد علی صاحب اپنے نظریہ کی تائید میں **ملائکہ** اور شیاطین کی بڑی دلچسپ اور روشن مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نیت اور عمل یا عقیدہ اور اس کے مطابق عمل کو ایک دوسرے کے برعکس خیال کرنا درست نہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی فطرت مقدسہ اور اس کی وحدانیت کا صحیح صحیح ادراک رکھتے ہیں انہیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ تصور اور حقیقت دونوں ایک دوسرے سے مختلف نہیں بلکہ ایک ہی ہیں۔ مولانا محمد علی صاحب نے قرآن اور حدیث کے حوالے سے اس بارے میں بڑے دلچسپ دلائل دیئے ہیں کہ دوزخ کی سزا لازماً دائمی نہیں۔ انہوں نے یہ نظریہ محض انسان دوستی کی رعایت سے پیش نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کی توحید کے حوالے سے اس دنیا کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اس میں دوزخ کا ایک دائمی ٹھکانہ ہونا موزوں نہیں بیٹھتا یہ ایک عارضی صورت ہے کیونکہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ کی کامل وحدانیت کی بنیاد پر تخلیق کی گئی ہے نہ کہ کسی دوہرے معیار کے مطابق گنہگاروں کے لئے دوزخ کی سزا اور نیکوں کے لئے جنت کی روحانی فرحت کو دو بالکل علیحدہ دنیاؤں کی طرف منسوب نہیں کیا جانا چاہئے۔ لاہوری احمدیہ لٹریچر میں اس کے متعلق جو یہ فلسفہ پیش کیا گیا ہے کہ دوزخ میں تزکیہ کے بعد اس سے نجات اور اس کے بعد جنت میں روحانی ترقی کے درجات طے کرتے کرتے کمال تک پہنچنا ایک ہی راہ کی مختلف منزلیں معلوم ہوتی ہیں ان کا مطلب دراصل اس ترقی کے ذریعہ ایک ہی مقصد کا حاصل کرنا ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا)۔ جوں جوں میں تحریک احمدیت (جماعت احمدیہ لاہور) کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کا مطالعہ کرتا گیا مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ نبی کریمؐ کی تعلیمات میں جو عالی ظرفی' رواداری' فراخدلی' انسان دوستی' انصاف اور آزادی اظہار نظر آتی ہے اس کا منبع اور سرچشمہ ایک ہی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ)۔ مولانا محمد علی صاحب نے دین متین کے جس پہلو پر بھی بحث کی ہے' انہوں نے اسے نہایت معقولیت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ملحوظ خاطر رکھا ہے وہ نہ صرف اللہ کی توحید پر مدلل اور مفصل بحث کرتے ہیں بلکہ ان کی سوچ اور فکر کا مرکزی نکتہ ہی اللہ تعالیٰ کی توحید ہوتا ہے۔ وہ اپنی زبان سے نہ بھی کہیں ان کا ذہن ہی اس دنیا میں ایک ہستی کے علاوہ کثیر خداؤں کی موجودگی تسلیم نہیں کرتا۔ اس پہلو سے تحقیق کا موضوع محقق کے طریق تحقیق سے مشابہ ہے اس لئے مولانا محمد علی صاحب کی تحریرات میں توحید پر ایمان رکھنے والے مذہب کے تجزیہ کے علاوہ بھی بہت کچھ ملتا ہے۔ یہ تحریرات بذات خود توحید اور وحدت کائنات کے تصورات کے مثالی نمونے ہیں۔

انگریزی سے ترجمہ

بے نظیر روحانی انوار کا الٰہی سرچشمہ-۸

مستشرقین اور اسلام

شیخ غلام ربانی ایم اے' ایل ایل بی

اسلام کے خلاف مغرب کا معاندانہ رویہ صلیبی جنگوں کے زمانے سے شروع ہوا اور تقریباً چار سو سال تک شدت سے قائم رہا۔ اسلام پر عسکری' ثقافتی اور معاشی ہر محاذ پر حملہ کیا گیا لیکن اشد ترین حملہ اس کا دینی محاذ پر تھا۔ یہاں اس کا تذکرہ شاید بے محل نہ ہو گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لانا اور حضرت مریم کے باعصمت ہونے پر یقین رکھنا اسلام کے اساسی تصورات میں سے ہیں۔ اس کے برعکس عیسائیوں نے اسلام کو اپنا حلیف سمجھنے کی بجائے سخت ترین دشمن سمجھا ہے۔ مسلمان اس پر ایمان لاتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کو خدا نے اپنی وحی سے سرفراز فرمایا تھا اور وہ خدا کی طرف سے خدا کا پیغام پہنچانے پر مامور تھے اور انہوں نے لوگوں کو نیکی اور راستبازی کی طرف ہی دعوت دی تھی۔ اس کے برعکس بہت سے مسیحیوں نے ابتدا سے ہی ایک ناقابل توضیح عناد اور تحقیر کا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مورد بنایا ہے اور اس بات سے کبھی تھکتے نہیں کہ محمد رسول اللہ صلعم اور ان کے دین کے بارے میں استخفاف آمیز باتیں کریں۔ اس رویہ کی نشاندہی کرتے ہوئے جو ابتدائی صدیوں کے عیسائی عرب' اسلام کے متعلق رکھتے تھے ایک عیسائی مصنف ڈوزی لکھتا ہے کہ:

"ابتدائی عرب مسیحی مسلمانوں سے جبلی نفرت رکھتے تھے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دین کے بارے میں قطعی غلط تصورات ان کے ذہن میں بیٹھ گئے تھے۔ عربوں کے درمیان رہتے ہوئے اس سے زیادہ کوئی بات آسان نہ تھی کہ وہ اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرتے لیکن ضد کی وجہ سے انہوں نے اصل ماخذ تک جانے کی ضرورت نہ سمجھی جو ان کو دہلیز پر بھی میسر آسکتی تھیں بلکہ غیر معقول افسانوں کو دہرانے اور ماننے پر مطمئن ہو گئے جو نبی عربیؐ کے بارے میں انہوں نے غلط جگہوں سے سن لئے تھے۔"

(Dozy quoted by Amir Ali in his "History of the Saracens," p.487)

چونکہ عیسائی دنیا شروع سے ہی اسلام کی سرعت سے بڑھتی اور پھیلتی ہوئی طاقت سے خائف ہو گئی تھی انہوں نے کبھی اسلام کو جو وہ ہے اس طرح پیش نہیں کیا بلکہ اس کو مسخ کر کے پیش کیا اور اس مسخ شدہ صورت پر حملے کرنے شروع کر دیئے اور اس کی تضحیک اڑاتے رہے۔ دشمن کے خلاف پروپیگنڈہ اور اس کے اعتقادات اور طرز زندگی کی تحقیر جنگ کے زمانے میں ایک عام طریق ہے چاہے اس کے بارے میں سنی ہوئی یا پھیلائی ہوئی باتیں جھوٹی یا سچی ہوں جیسا کہ انگریزی کا ایک مشہور محاورہ ہے کہ جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔ اور شاید یہ وقتی مصلحت بھی ہو لیکن صلیبی جنگوں کے گزر جانے کے بعد بھی اس پروپیگنڈے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسلام کے خلاف باتیں ایک ذیلی ثقافت کی طرح بیان کی جاتی رہیں جو مغرب کے ذہن اور روح میں سرایت کرتی رہیں اور ایک مضحکہ خیز اسلام کا تصور ان کے درمیان دائم اور قائم ہوا اور مغرب کا عام آدمی اسے ہی اصل

اسلام سمجھتا رہا۔ لیکن بدقسمتی تو یہ ہے کہ مغرب میں پڑھے لکھے لوگ بھی اس خیالی اسلام کو ہی اصل اسلام سمجھتے رہے اور اب تک سمجھ رہے ہیں۔ نفرت وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی اور گہری ہوتی چلی گئی اور ایک پختہ صورت اختیار کر گئی۔ اسلام کی تحقیر یورپی فکر کا اوڑھنا بچھونا بن گئی اور یہ آج تک اسی طرح سوائے چند ایک معمولی تبدیلیوں کے قائم ہے۔ جیسا سر ڈینس راس نے تسلیم کیا ہے:

"بہت صدیوں تک یورپین لوگوں کی اکثریت کا محمڈن ازم سے تعارف صرف متعصب عیسائیوں کی مسخ شدہ رپورٹوں تک ہی محدود تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے متعلق شدید بہتانوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو گیا۔ محمڈن ازم میں جو کچھ بھی اچھا تھا اسے نظرانداز کیا جاتا رہا اور جو یورپین آنکھ میں برا تھا اسے مبالغہ آمیز حد تک غلط معانی پہنائے جاتے رہے۔"

(Sir Denison Rose quoted by Khurshid Ahmad in his treatise "Islam and the West", p.22)

"مغربی مستشرقیت کی تاریخی جڑیں بطور ایک مذہبی مہم بازی کے ازمنہ وسطیٰ کے مسیحی مناظراتی دلدل سے بھی آگے آٹھویں صدی عیسوی تک چلی جاتی ہیں جب سینٹ جان دمشقی (وفات ۷۴۸ ب م) نے اسلام پر نہایت ضرر رساں طور پر حملہ کیا اور اس نے اس طویل روایت کا آغاز کیا جس میں محمد رسول اللہ صلعم پر (نعوذ باللہ) یہ الزام لگایا گیا تھا کہ حضورؐ نے (نعوذ باللہ) اپنی جنسی ہوس پرستی کو جائز گرداننے کے لئے ایک پر فریب طور پر خدا کی وحی کا ناٹک رچایا اور اس کے ثبوت میں زید اور زینب کے قصہ کو پیش کیا۔ یہ اس وقت سے عیسائیوں کے ہاں کلاسیکی موضوع بن گیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ محمد رسول اللہ صلعم نے اپنے عقائد کا محل عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کی عبارتوں کو سرقہ کر کے ایک عیسائی راہب کی مشاورت سے بنایا تھا۔ ایسے ہی خیالات کو بعد میں مسیحی مناظروں میں خاص اہمیت دی گئی۔"

(Norman Daniel, "Islam and the West -- The Making of an Image, Edinburgh University Press, 1960, p.4)

اس کی تقلید کرتے ہوئے عہد وسطیٰ کے عیسائی مبلغین اور مستشرقین نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) مسیح کا مخالف اور عرف عام میں دجال، ہوس پرست اور قرآن پاک کو ان کی شعبدہ بازیوں کی عظیم مثال کے طور پر متعارف کروایا۔ (اورینٹل ازم اینڈ اسلام لیسٹر ۱۹۸۹ء ص ۳)

شاذ ہی کوئی مقدس صحیفہ اس مریضانہ تحقیر کا شکار ہوا ہو جتنا کہ قرآن پاک۔ مرگی کے دورے، شیطان کا حلول، بحیرہ راہب سے متاثر ہونا، اپنی نفس پرستانہ خواہشات کے جواز میں خدا تعالیٰ کی وحی کا فریب جیسی باتیں (نعوذ باللہ) حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزول وحی الٰہی کی وضاحت کے طور پر پیش کی جاتی رہیں۔

"وہ اس قسم کی (نعوذ باللہ) دیوانگی کا شکار ہو گئے تھے کہ بقول ولیم آف ٹائیر کے انہیں اس بات کی بھی جرات ہو گئی کہ وہ اپنے آپ کو نبی اللہ کہنے لگ گئے کہ خدا تعالیٰ نے انہیں بھیجا ہے" (اسلام اینڈ دی ویسٹ ص ۲۰۷)

عہد وسطیٰ کے دلائل کا اکثر اوقات ہدف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ناقابل اعتبار ثابت کرنا تھا۔ یہ دکھا کر کہ قرآن بے ربط اور مہمل ہے اور یہ کہ ان آسمانی صحائف کے مطابق بھی نہیں جن سے یہ اپنا تعلق جوڑنے کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ کہ ایک مخصوص جگہ اور دور کی پیداوار ہے۔

عہد وسطیٰ کے مستشرقین مثلاً ولیم ٹائیر، مقدس ریکال ڈو، سینٹ پیڈرو کا یہ رویہ اور طرز تحریر تھی جو ابھی تک جاری ہے۔

خیالی شہادتوں، خود ساختہ تفاصیل، نامعقول حکایتوں، نظریوں، تعصب زدہ تعبیروں کی روشنی میں ان نقادوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور اسلام کا خود ساختہ ایک ڈھانچہ بنا لیا۔

سینٹ تھامس ایکویناس کے نزدیک اسلام کی نمایاں خصوصیات جنسیات اور تشدد ہیں۔ اسی طرح راجر بیکن کا نظریہ تھا کہ مسلمان تعدد ازدواج کی وجہ سے جنسی شہوت پرست اور لزائذ میں ڈوبا ہوا انسان ہوتا ہے۔

یہ وہ دانشور تھے جن کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے براہ راست اسلام کو پڑھا اور اس سے شناسائی حاصل کی ہے لیکن انہوں نے کبھی بھی اپنے ان عجیب و غریب نظریات کو مسلمانوں کی حقیقی زندگی سے تصدیق کروانے کی کوشش نہ کی۔ ان کو صرف تعدد ازدواج کی اجازت سے دلچسپی تھی نہ کہ مسلمانوں کی حقیقی ازدواجی زندگی سے۔ اسی طرح ان کی نظر طلاق کی اجازت پر مرتکز ہو گئی اور انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ مسلمانوں میں طلاق کی کثرت کس قدر ہے۔ اسلام کے بارے میں اسی طرح کے ذہن کی تخلیق کردہ تصورات اور قیاسی علم، نہ کہ حقائق پر مبنی علم پر انحصار کر کے انہوں نے تعلیم یافتہ اور دانشور طبقوں کو غلط باتیں باور کروا دیں اور آج تک ان کا اثر باقی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نارمن ڈینیل جیسے مفکر کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ "جب ہم کسی غیر جانبدار دانشور کو پڑھیں تو بھی ہمیں یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ کس طرح عہد وسطیٰ کے عیسائی ذہن اس بارے میں دلائل پیش کرتے تھے کیونکہ یہ مسیحی دنیا کی ذہنی اور علمی تعمیر کا غرور ہے اور اب بھی مغربی ذہن کا یہ ماؤف حصہ اس موضوع پر اسی رنگ میں غور کرتا ہے۔"

یہی خیالات عیسائی دنیا میں شرعی حجت کے طور پر سند پا گئے اور وہ صدیاں جو حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ظہور کے بعد گزریں ان میں رسول اکرم صلعم کی نبوت کو جانی پہچانی ہوئی نبوتوں سے علیحدہ کر کے (نعوذ باللہ) جعلی نبوت اور شر شمار کیا جانے لگا کیونکہ اس کی معجزات سے تصدیق نہ ہو سکی تھی۔ عرب سے متعلقہ حقائق جو حضرت صلعم کی پیدائش، ان کی ابتدائی زندگی، ان کے نبوت، ان کی شادیاں اور ان کی وفات تک پہنچتے ہونے والے کوائف کو ایسے مبالغہ آمیز رنگ میں بیان کیا جانے لگا کہ وہ مسخ ہو کر ناقابل شناخت اور صحت سے محروم ہو جائیں اور ایسا بنا دیا گیا کہ وہ محض ایک انسان ہے۔ اور اس لئے ان سے خطا ہو سکتی تھی۔ اس تصویر کو جو مغربی قلمکاروں نے بنا دی تھی دھندلا ہونے سے محفوظ رکھنے کے لئے انہوں نے ہر غلط اور جھوٹی بات کو جو نبیؐ سے منسوب کر دی گئی ہو مضبوطی سے پکڑ لیا تاکہ ان سے اسلام اور نبیؐ کی تحقیر اور تخفیف ہو سکے کیونکہ وہ اس کے پیغمبر اور اس کے دین کو ناپسند کرتے تھے، کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آنے والی نسلیں بھی ایسا ہی کرتی رہیں۔

اسلام اور نبیؐ کے متعلق یہ عام رجحان تھا کہ ہر غلط اطلاع کو پھلنے پھولنے کا موقعہ دیا جائے اور اس میں ہر کوئی ایک دوسرے سے زیادہ سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا کہ نہ صرف یہ پھلیں پھولیں بلکہ زیادہ قوت حاصل کرتی رہیں اور ان ہی کی تکرار ہوتی رہے اس دانشورانہ حقارت کے رجحان کو عہد وسطیٰ کے آخری نظریاتی ماہرین مثلاً نکولس آف کوسا، ڈینس وان لیکوین اور ہسپانوی پادری جان ٹارکو اور انفاسنو سے بھی مزید قوت ملی۔ یہ سب تازہ ذہن تھے جو پرانے نظریات پر ہی کام کرتے رہے اور ان کی تنقیدوں کی تفاصیل ان پرانی باتوں کو دہرانے کے سوا کچھ نہ تھیں جو صدیوں سے ان کے آباؤ اجداد ان کو سناتے آئے تھے۔ اٹھارویں صدی میں جو عہد تنویر کہلاتی ہے مشہور دہریہ قلمکاروں والٹیر سواری اور گبن نے عہد وسطیٰ کے ہتھیاروں سے اسلام کے حوالے سے مذہب پر عام طور سے حملہ کیا۔ مثلاً والٹیر نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ "انہوںؐ نے کئی بکھرے ہوئے ٹکڑوں سے جو انؐ کے اردگرد پڑے تھے جوڑ کر ایک جدید مذہب ایجاد کیا۔ لیکن یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ پیغمبر کو (نعوذ باللہ) ایک جوشیلا یا جعلساز قرار دے۔ اس طرح نام نہاد روشنی کے دعویداروں کا روشن رویہ بھی اسلام پر صحیح طور سے ارتکاز نور نہ کر سکا۔

انیسویں صدی عیسوی میں ٹامس کارلائل نے اپنے مضمون "ہیرو بحیثیت ایک پیغمبر" میں روایتی نکتہ نظر سے بنیادی طور پر ضرور

ہٹ کر بات کی جب اس نے اسلام اور نبیؐ پر یہ بیان دیا کہ "اگر اخلاص سے دیکھا جائے تو قرآن میں ہر پہلو سے مجھے خوبی دکھائی دیتی ہے اور یہ کہ ہم بہت غلطی پر ہوں گے اگر ہم اس شخص کو (نعوذ باللہ) ایک عام قسم کا شہوت پرست سمجھیں۔" ہر چند اس نے روایتی نظریے پر تنقید کی تھی لیکن وہ بھی ان روایتی خیالات کے جال سے اپنے آپ کو پورے طور پر نہ نکال سکا اور اس نے اپنی کتاب میں بھی روایتی نظریہ کو عام طور پر دہرایا کہ "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک اور اپنے مذہب کو یہودی، عیسائی اور کفار و ملاحدہ کے فکری مواد سے گھڑ لیا تھا" (نارمن ڈینیل ص ۲۹۱)۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ "اب تک جو (مسیحی دنیا میں) کہا گیا ہے اس نے فکری رجحان کو اس حد تک مغلوب کر لیا ہوا ہے کہ کسی نئے خیال کو شروع کرنا خارج از امکان تھا۔ شاید آج بھی ماضی سے رہائی صرف ان ذہنوں کے لئے ممکن نظر آتی ہے جو ماضی کی روایات سے آزاد ہو چکے ہیں یا وہ لوگ جو عام یورپی مسیحیت کے ماحول سے باہر کسی اور ماحول میں پیدا ہوئے ہوں" (ایضاً" ص ۲۹۱)۔ انیسویں صدی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ ایسے سوانح نگار بھی نظر آتے ہیں مثلاً گستاو وائیل (۱۸۴۳)، ولیم میور (۱۸۶۱) اور الائے سپرنگر (۱۸۶۵) لیکن انہوں نے بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دین اور مشن کے بارے میں کوئی بہتر تفہیم پیدا کرنے کی کوشش نہ کی۔

انیسویں صدی مستشرقین کے مطالعہ متن قرآن کی بھی صدی کہلاتی ہے اس میں انہوں نے قرآن کے متن کی تاریخ واریت پر بھرپور تنقید کی۔ تین دانشور جن کو اس موضوع کے بارے میں زیادہ دلچسپی محسوس ہوئی وہ الائے سپرنگر، مائیکل اعبری اور تھیوڈور نولڈیک تھے۔ تھیوڈور نولڈیک کی تصنیف Ges chichte des Quran کو اس سلسلہ میں بنیادی حیثیت دی جاتی ہے اور اسے اس صدی کا عظیم کارنامہ سمجھا جانے لگا۔

مستشرقین کے علمی اور سائنسی تحقیقات کے جھوٹے دعاوی بھی اپنے موروثی اور بنیادی تعصبات سے پاک نہ تھے اور ان کی کتابیں مناظرانہ اور ہتک آمیز تھیں۔ قرآن پاک کے ان دانشوروں نے قرآن پاک کے ابواب کو نئے طور پر ترتیب دینے کی کوشش کی اور اس میں کئی ادبی نقائص اور تضادات، مبہم سطور، نامانوس الفاظ اور بعض جگہ پر قواعد عربی اور سٹائل کے نقائص موجود ہونے کا بھی اہتمام گوارا کیا (اورینٹل ازم اینڈ اسلام ص ۴)۔

مستشرقین کی اس ساری کوشش کا حتمی مقصد قرآن پاک کی تاریخی حیثیت کے حوالے سے یہ نظر نہیں آتا کہ وہ اس کی صداقت پر کوئی فیصلہ دے سکیں بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوتاہ نظر مزعوم ماننے والوں کو الجھایا اور متزلزل کیا جائے۔ ان کی تمام مساعی کا محرک فرقہ وارانہ عصبیت اور یہ جذبہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ قرآن پاک (نعوذ باللہ) ایک بھونڈی کوشش کی گئی کہ بائبل کو نقل کیا جائے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہود و عیسائی روایت کی طرز پر (نعوذ باللہ) ایک جعلی وحی کے بنانے والے سے بڑھ کر کچھ نہ تھے۔

مستشرقین کی ان فضول اور ناروا حملوں نے خود اس میدان کے مردان ذی شعور کو بھی بہت صدمہ پہنچایا ہے مثلاً ایک سکالر اگناز گولڈزیر جس پر اسلام کے طرفدار ہونے کا ذرا بھی احتمال خارج از امکان ہے۔ احتجاجاً" چیخ کر کہتا ہے کہ اناجیل کا کیا رہ جائے گا کہ اگر ان پر بھی وہی طرز تنقید لاگو کیا جائے جو قرآن پر یہ عقل کے اندھے لاگو کر رہے ہیں" (میتھڈا گینسٹ ٹروتھ ص ۳۴)

بیسویں صدی میں مغربی سکالروں میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات کے مطالعہ اور رویے کے بارے میں تبدیلی آگئی ہے وہ اس کو اپنے طور پر سمجھنے اور اس کی تعلیمات کو اور زیادہ شفاف طور پر معنی پہنانے کا دعویٰ کرنے لگے ہیں لیکن یہاں بھی نتیجہ وہی ہوا ہے کہ "رسول اکرم صلعم کے دعاوی سچے نہیں"۔ وہ اسلام کو اپنے گزوں سے ناپتے ہیں اور اسلام جیسا ہے ویسا اسے پیش

نہیں کرتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کی اپنی دینیاتی اقدار کے مطابق اسے منطبق کر کے دکھائیں۔ مغربی قلمکاروں کو حق ہے کہ وہ اسلام پر تنقید کریں لیکن وہ اس پر روشنی ڈالنے کا لبادہ اتار دیں اور اسے زیادہ قابل فہم بنانے کی کوشش ترک کر دیں۔

منٹگمری واٹ جو اس نئے مستشرقین کے گروہ کے بلند بانگ سرخیل گنے جاتے ہیں اور جن کے بارے میں اس بات کو شہرت دی گئی ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں ہمدردانہ نکتہ نظر رکھتے ہیں وہ بھی اس بارے میں مغالطے کا شکار ہیں۔ اسلام کے بارے میں جو ان کا موقف ہے وہ اسلام کے اساسی رکن توحید ہی پر کاری ضرب لگاتا ہے ان کا نام نہاد شیطانی آیات کے واقعہ سے گہرا انہماک' جس کے متعلق وہ اپنی دو کتابوں "حضرت محمدؐ مکہ میں" اور "اسلام کیا ہے" میں تفصیل سے ذکر کرتے ہیں درحقیقت جان پیڈرو کی وحی کے بارے میں "دخل شیطان" کے نظریے کی ہی گونج سنی جا سکتی ہے۔ جان پیڈرو کا خیال تھا کہ اس زمانے کے عربوں کا وقت کے بارے میں تصور' مبہم اور غیر متعین نظریہ توحید اور اس دور کی تاجرانہ سوسائٹی کے معاشی اور سماجی الجھاؤ کی بے چینی قرآن کی شکل میں پیش کر دیئے گئے (اسلام کیا ہے ص ۱۳'۱۴)۔ بیشتر مغربی قلمکار ابھی تک قرآن کے الہیاتی ہونے کے بارے میں تشکک میں مبتلا ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا مصنف سمجھتے ہیں۔ ایک معاصر نقاد پروفیسر مارگولیتھ لکھتا ہے:

"اس طاقت کا راز جو اس کتاب کے ذریعے متاثر کرتی ہے اس ذہن میں ہے جس نے اسے تخلیق کیا ہے۔ دراصل شروع میں یہ کتاب نہ تھی بلکہ ایک زندہ طاقتور آواز تھی' ایک صحرائی حاکمانہ آواز میں منادی' جس میں فہمائش' وعدے' دھمکیاں اور ہدایات کا سلسلہ تھا جو ہنگامہ پسند اور بیشتر تندخو اجتماعات کے غیر مہذب عربوں کو مخاطب کر کے دی گئی تھیں۔ اس لئے قرآن مجید کے بارے میں گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے آپ عملاً محمدؐ کے بارے میں ہی گفتگو کر رہے ہوں"

(اسلام اینڈ دی ویسٹ ص ص ۳۰'۳۱)۔

اگر جدید مستشرقین کی علمیت کا یہ ایک نمونہ ہے تو یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ دور کے مستشرقین نے اسلام کے بارے میں حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کر لیا ہے اور یہ کہ انہوں نے اپنے عہد گزشتہ کے تعصبات سے اپنے آپ کو آزاد کرا لیا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بعض مغربی قلمکاروں نے ایک سنجیدہ کوشش اس نہج پر کی ہے مثلاً کیتھ کریگ اور جان بی ٹیلر ہیں جنہوں نے صورت حال کی اصلاح کی کوشش کی ہے اور اسلام اور قرآن پاک کی ایک بہتر تصویر کی معروضی شکل میں عکاسی کی ہے لیکن عمومی طور پر موجودہ نسل کے مستشرقین جن میں واٹ' اینڈرسن' مارگولیتھ' برٹن اور نوجوان یہودی دانشور جان وانس برا شامل ہیں ان کی تحریرات براہ راست یا بالواسطہ قرآن پاک پر اب بھی حاسدانہ' معاندانہ اور کفریہ انداز میں اتہامات کی ہی گونج ہے جو ان کے ماضی کے اساتذہ نے لگائے تھے گو ذرا مدھم اور نتھرے ہوئے انداز میں اور اب بھی قرآن پاک کو وہ خدا کا کلام ماننے کو تیار نہیں۔ بعض کے نزدیک قرآن پاک' محمد رسول اللہ صلعم کی ایک دلپسند خواہش یا تخلیق کردہ تصور ہے جو زمانے اور اس ماحول کے حسب حال یہود و نصاریٰ کے شدید دباؤ کے نتیجے میں وجود میں آیا۔

جے ایم راڈویل نے اپنے ترجمہ قرآن پاک کے دیباچے میں لکھا ہے کہ کس طرح اور کس جہت سے اسلام پر حملہ کرنے کا انداز اختیار کرنا چاہئے:

"مسلمانوں سے مناظروں میں عیسائی مشنریوں کو اسلام پر حملہ کرنے کے لئے یہ راہ اختیار نہیں کرنی چاہئے کہ اسلام غلطیوں کا ایک انبار ہے بلکہ انہیں کہنا یہ چاہئے کہ اس میں صداقت کے ٹکڑے ہیں جو یہودیت اور نصرانیت پر مبنی ہیں لیکن ان کو جزوی طور پر ہی سمجھا جا سکا ہے خاص طور پر اول الذکر کے حوالے سے اور اس پر اصرار کرنا چاہئے

کہ آخری اور مکمل ظہور عیسائیت ہی ہے" (اسلام اینڈ دی ویسٹ ص ۵۱)۔

یہ درست ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ کے تاریخی اور سماجی ماحول کا حصہ تھے جس سے وہ خود متاثر ہوئے اور اس پر اثر بھی ڈالا تاکہ جو مشن ان کو سونپا گیا تھا اس کا حق ادا ہو سکے لیکن یہ غلط ہو گا اگر ان کے مشن اور ان کی کامیابیوں اور ان کے اعمال کو زمان و مکان کی ضرورت سے الجھا دیا جائے کیونکہ وہ ہمارے زمانے کے لئے بھی ایسے ہی پیغمبر ہیں جتنے کہ وہ عرب قوم اور اپنے معبوث ہونے والے وقت کے پیغامبر تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کوئی جامد تصور نہیں بلکہ ایک متحرک اور قوت آفریں تصور ہے جو تمام زمانوں کو ان کی نبوت کے لئے فتوح کرتا ہے۔ مستشرقین کا یہ زہر قند بیان اور اظہار جس سے وہ اسلام کو یہودیت' نصرانیت اور کفریہ افکار سے جوڑتے ہیں اور اس کو ان کا پس خوردہ قرار دیتے ہیں نہ تو درست ہے اور نہ اسلام کے لئے عدم اعتماد کا ثبوت ہے کیونکہ اسلام کوئی نیا دین نہیں۔ یہ تو صرف اعادہ اور تصدیق ہے اپنے سے پہلے ادیان اور وحیوں کا اور ان کی تکمیل کے لئے آیا ہے:

"ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے کتاب میں سے ہے اور اس پر نگہبان" (مائدہ ۵:۴۹)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام اور دوسرے ادیان میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں اس لئے نہیں کہ یہ ان سے اخذ کیا گیا ہے بلکہ اس لئے کہ تمام کا منبع ایک زندہ خدا ہی تو ہے جو ہر جگہ ہے جو قادر مطلق ہے اور ہر جگہ دیکھتا ہے۔ جو یہودیوں کا خدا ہے نصرانیوں کا خدا ہے اور تمام مخلوقات کا خدا ہے۔ جہاں تک اس الزام کا سوال ہے کہ قرآن پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دل پسند خواہش اور تخلیقی تصور کا نتیجہ ہے تو آج تک کوئی بھی انسان اس کے مقابل میں ایک سطر بھی نہیں لکھ سکا چاہے خواہ وہ اس کی دل پسند ہو یا تخلیقی تصور ہو یا کچھ اور۔ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی اور ثبوت ہو سکتا ہے کہ قرآن وحی الٰہی ہی ہے اور چودہ سو سال گزر جانے پر بھی قرآن کا ذیل کا یہ چیلنج بغیر جواب کے رہا ہے:

"اور اگر تمہیں اس میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو ایک سورت اس جیسی لے آؤ اور اپنے مددگاروں کو اللہ کے سوا بلا لو اگر تم سچے ہو" (بقرہ ۲:۲۳)

"یا یہ کہتے ہیں کہ اس نے جھوٹ بنایا ہے کہہ پھر اس جیسی دس سورتیں ہی بنائی ہوئی لے آؤ اور اللہ کے سوائے جسے بلا سکتے ہو بلا لو اگر تم سچے ہو" (ہود ۱۱:۱۳)

"اور اگر انسان اور جن اس بات پر اکٹھا ہو جائیں کہ اس قرآن کی مانند بنا لیں۔ تو اس کی مانند نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں" (بنی اسرائیل ۱۷:۸۸)

اے' ڈی' عجیج اللہ نے اپنی کتاب "اسینس آف فیتھ ان اسلام" میں اس بارے میں خوب لکھا ہے۔

"کیا خوب چیلنج ہے اس طرح کا چیلنج اس سے پہلے کبھی انسان نے نہیں دیکھا اور نہ اس کے بعد آج تک دیکھا ہے۔ ان لوگوں کو جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن خدا کا کلام نہیں یہ چیلنج ہمیشہ کے لئے زچ کرنے کو کافی ہے جو ان کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے دائمی طور پر ان کی جہالت' عصبیت' نااہلیت اور ناطاقتی کا ثبوت رہے گا۔" (ص ۹۰)

بی بی سی لندن کا حالیہ پروگرام

ترجمہ: کیپٹن عبدالسلام خان

حضرت عیسیٰؑ سے حضرت یسوعؑ تک

(نوٹ: اپریل ۱۹۷۷ء میں بی بی سی ٹیلیویژن' لندن کے پروگرام Who was Jesus یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کون تھے' پیش کیا گیا تھا۔ اس پروگرام کو کیمبرج یونیورسٹی کے فلسفہ مذاہب کے پروفیسر ڈان کیوپڈ صاحب نے پیش کیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش' وفات' صلیب کے بعد جی اٹھنا اور آسمان کی طرف اٹھ جانا اور ان کی طرف منسوب عیسائی عقائد کے بارے میں اس نہایت عالمانہ اور دقیق گفتگو میں پروگرام پیش کرنے والے کے علاوہ ذیل کے ماہرین نے بھی شرکت کی۔ جن کے اسمائے گرامی یہ تھے:

۱۔ مانچسٹر یونیورسٹی میں قدیم تاریخ کے پروفیسر انتھنی برلے' ۲۔ درھم یونیورسٹی' سینٹ چاڈز کالج کے پرنسپل جان فیشن' ۳۔ یروشلم میں راک فیلر عجائب گھر کے مہتمم اعلیٰ ڈاکٹر روحانی' ۴۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں عہد نامہ جدید کے ماہر پروفیسر جارج کیرڈ اور ۵۔ یروشلم میں عبرانی یونیورسٹی میں "عیسیٰؑ کی زندگی" کے مصنف ڈاکٹر ڈیوڈ فلاسر۔

تقریباً دس سال کے بعد اپریل ۱۹۹۷ء میں بی بی سی ٹیلیویژن لندن پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اسی نوعیت کا ایک اور نہایت دلچسپ پروگرام دکھایا گیا ہے جس کا عنوان Jesus before Christ تھا۔ یعنی نجات دہندہ بننے سے قبل حضرت عیسیٰؑ کیا تھے۔ دوسرے الفاظ مغرب کے علمی اور مذہبی حلقوں میں ان حضرت عیسیٰؑ کی تلاش کے لئے نہایت سنجیدگی سے کوشش ہو رہی ہے جن کو عیسائیوں نے خدا کے ایک برگزیدہ نبی سے بڑھا کر گناہوں کا نجات دہندہ بنا کر ان کو خدائی صفات سے متصف کر دیا ہے۔ اس پروگرام کے پیش کرنے والے اے این ولسن A.N.Wilson ہیں جو برطانیہ کے ایک مشہور و معروف صحافی اور ناول نگار ہیں۔ ان کے علاوہ ذیل کے لوگوں نے اس گفتگو میں حصہ لیا:

۱۔ جنوبی فلوریڈا' امریکہ کے ماہر آثار قدیمہ پروفیسر جم سٹرینج' ۲۔ آکسفورڈ یونیورسٹی' انگلستان کے مطالعہ یہودیت کے پروفیسر ایمارٹیس گیزا ورمیز' ۳۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر گلیلی کے تاریخی پس منظر کے ماہر اور تاریخ دان شان فرائن' گلیلی وہ جگہ ہے جہاں سے حضرت مسیح نے تبلیغ کا آغاز کیا تھا اور کافی لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کو قبول کیا تھا' ۴۔ یروشلم میں یہودیوں کی عید سے متعلقہ رسومات کے ماہر ایڈ سانڈرز اور ۵۔ یروشلم میں آثار قدیمہ کے علم الانسان کے ماہر جو زیاس۔

پہلے پروگرام یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کون تھے کا اردو ترجمہ دو اقساط میں گذشتہ دو شماروں میں پیش کیا جا چکا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان دونوں پروگراموں میں گفتگو مذہب کے متعلق ہے اور اس مقدس شخص کے متعلق ہے جو عیسائی مذہب کی بنیاد ہے بلکہ ان کا خدا ہے۔ لیکن گفتگو کا انداز کتنا عالمانہ' تجزیہ کتنا بے باک اور دلائل اور واقعات کو کس قدر بے لاگ طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان میں اکثر باتیں چرچ کے مسلمہ عقائد کے خلاف ہیں اور بائبل جو ان کے نزدیک مقدس کتاب ہے اس پر سخت تنقید ہے۔ ذیل میں حالیہ بی بی سی پروگرام کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ مدیر)

رگبی سکول کے چرچ کی اس عمارت میں چرچ آف انگلینڈ میں میری باقاعدہ ممبر بننے کی رسم ادا ہوئی تھی۔ اس تقریب کے دوران ہم نے جو حمد گائی اس کا عنوان تھا "اے عیسیٰ! میں نے آخری دم تک تیری خدمت کا وعدہ کیا ہے" لیکن آنے والے سالوں میں میں نے یہ وعدہ توڑ ڈالا جیسے اکثر لوگ توڑتے ہیں۔ جب میں نے یونیورسٹی میں دینیات کے مضمون کو پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق بہت سی کہانیاں جنھیں میں تاریخی واقعات سمجھتا تھا (مثلاً بیت اللحم کے ایک اصطبل میں ان کی پیدائش اور صلیب کی موت کے بعد تیسرے روز ان کا جی اٹھنا!) دراصل فرضی قصے تھے! جوں جوں میرا بائبل کے نئے عہدنامے کا مطالعہ گہرا ہوتا گیا توں توں یہ بات کہ حضرت مسیح ناصریؑ خود اپنے آپ کو خدا یا خدا کا حصہ سمجھتے تھے یا یہ کہ انہوں نے غیر یہودیوں کے لئے ایک مذہب کی بنیاد ڈالی تھی'

ناقابل یقین تر ہوتی گئی۔ حضرت عیسیٰؑ کے حضور انہیں زندہ یا خدا سمجھ کر دعا کرنے پر مجھے بے چینی محسوس ہونے لگی' رفتہ رفتہ بہت دکھ کے ساتھ عیسائی مذہب پر سے میرا اعتقاد مکمل طور پر اٹھ گیا۔ اور یہ حقیقت عیاں ہوتی گئی کہ ایمانیات کا مسیح جو کہ مخلص عیسائیوں کے دل میں جاگزیں ہے' کا تاریخی مسیح سے کوئی خاص یا بالکل تعلق نہیں۔

عیسائیت کے ان فرضی قصوں کے پیچھے ایک حقیقی انسان ہے' خدا نہیں وہ وہ مسیح ہیں جو میری دلچسپی کا باعث ہے ...... ایک ایسی شخصیت جس کی مذہبی' اخلاقی اور منفرد تعلیمات اس حالت میں بھی ہمیں چونکا دیتی ہیں جبکہ ہم ان کے معجزاتی واقعات مثلاً بادلوں میں ان کا اٹھایا جانا پر ایمان لانا چھوڑ چکے ہوں۔

جب مجھے نیا عہد نامہ پڑھایا گیا تو ہمیں بتلایا گیا کہ تاریخ میں یسوع کے متعلق کوئی ایسی خاص فائدہ مند بات نہیں ہے جو قابل ذکر ہو اور یہ سوال کرنا کہ آیا یسوع کا آسمان کی طرف رفع سچ مچ وقوع میں آیا تھا' ایک بلا مقصد سوال ہے! اس سے ہمیں اناجیل کو محض فرضی قصوں پر مشتمل تصانیف سمجھ کر رد کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ مگر عیسائیت نے ہمیشہ اصرار کیا ہے کہ ان کا تاریخی ماخذ حضرت مسیحؑ کی زندگی ہے یعنی اناجیل کا یسوع محض ایک دیومالائی فرضی شخصیت نہیں بلکہ رابن ہڈ اور کنگ آرتھر سے زیادہ حقیقی ہے۔ ان میں ہمیں ان کی جو تصویر نظر آتی ہے مثلاً ان کا بیماروں' سماج کے دھتکارے ہوئے اور گنہگاروں کے لئے رحم' وہ بڑی واضح ہے اس لئے اگرچہ تاریخی مسیح کو تلاش کرنے کی کوشش میں محتاط راہ اختیار کرنا درست ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تاریخی طور پر ان کے متعلق جاننے کو کچھ مواد بھی موجود نہیں یا یہ کہ اس لحاظ سے ان کے متعلق کوئی کام کی بات نہیں کہی جا سکتی! یسوع کے عہد کے وہ سال جن کے متعلق ہمیں کچھ خبر نہیں' ان سے متعلق دستاویزات اور پھر ان پر فرضی قصوں کی ایسی تہہ چڑھی ہوئی ہے کہ سچ کو افسانے سے جدا کرنا مشکل ہو گیا ہے اور عرصہ دراز گزرنے کی وجہ سے بھی یہ تہیں بڑھتی گئی ہیں۔ دوسری صدی عیسوی کے وسط میں جسٹن مارسیر (JUSTIN MARSYR) اس بارے میں کہتا ہے:

"اگر کوئی شخص یسوع کی پیدائش کا ثبوت چاہتا ہے تو وہ بیت اللحم جائے اور اس غار کو دیکھے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے اور اس (چرنی) کو دیکھے جس میں اسے لٹایا گیا تھا۔"

بیت اللحم کار کے ذریعہ یروشلم سے ۲۰ منٹ کا راستہ ہے۔ زائرین اس عقیدہ کی بنا پر کہ حضرت مسیحؑ اس گرجا میں پیدا ہوئے تھے' زیارت کو آتے ہیں کہ اس کے غار میں وہ جگہ واقع ہے جہاں یسوع پیدا ہوئے تھے۔ کرسمس کی کہانیاں ہمیں بتاتی ہیں کہ یسوع کو اس لئے چرنی میں لٹایا گیا تھا کیونکہ سرائے میں مریم اور یوسف کے لئے جگہ دستیاب نہ تھی۔ مگر یہ زیارت گاہ بادشاہ کانسٹن ٹائن کی والدہ ملکہ ہیلن نے تعمیر کروائی تھی۔ چوتھی صدی عیسوی میں انہوں نے ارض مقدس کا دورہ کیا تھا۔ روایت کی جاتی ہے کہ انہیں کشف میں بتایا گیا کہ اناجیل میں مذکور واقعہ یہاں ہوا تھا اور تب سے عیسائی یہاں آکر عبادت کرتے ہیں۔

مرقس کی انجیل جو کہ احتمالاً ۷۰ عیسوی یعنی یسوع کی وفات کے ۴۰ سال بعد لکھی گئی بیت اللحم میں پیدائش کا کوئی ذکر نہیں کرتی۔ یہ تو صرف صدی کے آخر میں جیسا کہ متی اور لوقا میں ہے ہمیں یہ بات سنائی دیتی ہے مگر دونوں کے بیانوں میں بڑا واضح اختلاف ہے۔ متی بادشاہ ہیروڈ کے عہد میں یسوع کی پیدائش کا تعین کرتا ہے جو کہ سنہ ۴ ق م میں فوت ہوا اور لوقا یسوع کی پیدائش گورنر سر سینیس کے دور میں متعین کرتا ہے جو کہ سنہ ۶ عیسوی کا شروع تھا۔ گویا ان دونوں بیانات میں دس سال کا فرق ہے۔

ان وجوہات کی بناء پر ایک مذہبی مورخ "پالا فریڈر کسن" حضرت مسیح سے متعلق تاریخی واقعات کو بیت اللحم کا حصہ نہیں سمجھتا۔

اوائل کی روایات سے نہ پولوس اور نہ ہی مرقس (جو کہ متی کے ماخذوں میں سے ایک ہے) کی اس بات کی توثیق ہوتی ہے اور جب اس سلسلہ میں لوقا کا موازنہ کیا جاتا ہے تو ہمیں دکھائی دیتا ہے کہ بالآخر جب دونوں نے اپنی اپنی انجیل لکھنا شروع کی تو اس وقت ان اناجیل کے لکھنے کے کچھ مذہبی محرکات تھے۔ اس کی پیدائش کو ٹھیک اس جگہ دکھانا جس کے متعلق پیشگوئی موجود تھی کہ اس جگہ مسیح پیدا ہوں گے' اس بات کا ثبوت فراہم کرتے نظر آتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ ہی مسیح ہیں اور (یونانی میں مسیح کے لئے لفظ کرائسٹ آیا ہے)

سوال: بیت اللحم کی کیا اہمیت ہے؟

جواب: یہ مقام میکاہ نبی کی پیشگوئی سے ڈانڈے ملاتا ہے جس میں مذکور ہے کہ داؤد کی نسل سے ایک رہنما ہو گا جو بیت اللحم میں پیدا ہو

گا؟" (۲:۵)

سوال: تو گویا آپ جو کہہ رہی ہیں وہ یہ ہے کہ یہی لکھاری، جو بھی ان کے نام ہوں، اعتقاد رکھتے تھے کہ یسوع داؤد کی نسل سے تھے اور ایمان رکھتے تھے کہ وہ مسیحا تھے اور پھر انہوں نے ایسے قصے گھڑے جو ان عقائد یا خیالات میں صحیح طور پر ڈھل گئے۔

جواب: یہ صرف خیالات ہی نہیں بلکہ دراصل وہ قدیم یہودی مقدس کتب کی طرف رجوع کر رہے ہیں جو یونانی میں دستیاب ہیں تاکہ تحریرات کے ذریعہ انہیں یسوع کے زندگی کے حالات اور واقعات سے متعلق قابل اعتبار معلومات حاصل ہو سکیں۔ جو چیز تاریخی طور پر مشکوک نہیں وہ یہ ہے کہ ایک تاریخی شخصیت یسوع نامی واقعی تھی کچھ سیاحوں نے اس سے انکار کیا ہے۔ مگر وہ بھی یہودی واقعہ نگار **جوزیفس** کی غیر عیسائی گواہی کو تسلی بخش طور پر رد نہیں کر سکے۔ اگرچہ مندرجہ ذیل عبارت کے صحیح الفاظ پر شکوک موجود ہیں مگر سیاح عموماً یہ بات مانتے ہیں کہ **جوزیفس** نے یہودیوں کی جو تاریخ ۸۰ اور ۱۰۰ عیسوی کے درمیان مرتب کی ہے اس میں وہ حضرت مسیح کے مخالفوں کے متعلق لکھتا ہے:

"تقریباً انہی ایام میں عیسیٰ ایک عقلمند شخص رہتا تھا وہ حیرت انگیز کارنامے انجام دیتا تھا اور ایسے لوگوں کا جو نئی نئی باتوں کے شوقین ہوتے ہیں استاد تھا۔ بہت سے یہودی اور یونانی اس کے گرویدہ ہوئے۔ معاشرے کے سرکردہ ممبران کی طرف سے جرم عائد کرنے پر پلاطوس نے اس کو صلیب پر لٹکانے کی سزا دی۔ مگر وہ لوگ جو اس سے شروع سے محبت کرتے تھے انہوں نے یہ جذبہ محبت ختم نہ ہونے دیا!"

سوال: بلاشبہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ **جوزیفس** کی کتاب میں خود حضرت عیسیٰ کے متعلق عبارت بعد میں عیسائیوں کی طرف سے اضافہ ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟

جواب: بہرحال یہ عبارت دلچسپ ہے۔ میری رائے میں اس کے کچھ حصے ضرور مستند ہونے چاہئیں خاص طور پر اس لئے کہ یہ عبارت یسوع کے متعلق نہیں ہے، یہ یسوع کے بھائی جیمز کی موت کے متعلق ہے (وہی یسوع جو مسیحا ہونے کا دعویدار ہے) مگر جیمز تو ۶۲ عیسوی میں مارا گیا تھا اس کا ذکر کیوں؟ اس کے ذکر کا جواز نہیں بنتا بجز اس کے کہ وہ کسی ایسے گروہ کا فرد ہو جو کہ اس وقت جبکہ **جوزیفس** تاریخ مرتب کر رہا تھا اسرائیل میں قابل ذکر مقام حاصل کر چکا ہو۔

سوال: کیا چرچ کی ابتدا ایسی ہی ہوئی تھی؟

جواب: ایسا ہی معلوم ہوتا ہے؟

یسوع نے گلیلی میں پرورش پائی۔ اغلباً" ناصرہ کے چھوٹے سے گاؤں میں ۴ ق م کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت یوسف ایک بڑھئی تھے اور یسوع کو بھی باپ کے پیشہ میں تربیت دی گئی۔ ناصرہ میں واقع سینٹ جوزف چرچ کے اصطباغ خانہ میں پہلی صدی عیسوی کے زمانہ کی ایک رہائش گاہ ہے جو کہ روایتی طور پر "بڑھئی کی دکان" کہلاتی ہے۔ گمان غالب ہے کہ یسوع کا خاندان کافی خوشحال تھا۔ آرامی لفظ "نگر" NAGGAR جس کا یونانی بائبل میں لفظ "ٹک ٹوم" TEKTOM ترجمہ کیا گیا ہے (یعنی کاریگری) اس کے معنی "ایک عالم انسان" بھی ہوتا ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ حضرت یسوع کا بچپن گمنامی میں چھپا ہوا ہے۔ ان کی بجائے ہمیں ان سے متعلقہ زیارت گاہیں ملتی ہیں مثلاً وہ کلیسا (Church of the Enunciation) جس کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہاں عظیم فرشتے جبرائیل نے حضرت مریم کو خوشخبری دی کہ وہ خدا کا بیٹا جنے گیں اور یہ بیٹا داؤد کے تخت کا وارث ہو گا۔

۱۹۴۷ء میں قمران میں جو بحر مردار کے کنارہ واقع ہے جو لپٹے ہوئے صحیفوں کے ٹکڑے دستیاب ہوئے تھے ان سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ پہلی صدی کے یہودیوں میں یہ توقع زور پکڑ چکی تھی کہ خدا کی بادشاہت آنے والی ہے۔ ہمارے لئے ان لوگوں کی بے چینی کا تصور کرنا قریباً ناممکن ہے جو کہ مسیحا کے کسی لحہ بھی آنے کے منتظر تھے۔

سوال: میرے ذہن میں یہ بات ہمیشہ غیر واضح رہی ہے کہ پہلی صدی کے یہودیوں کی "مسیح" سے کیا مراد تھی؟

"اچھا یوں سمجھ لیں کہ آپ کا مسیح کے بارے میں تصور کا انحصار اس بات پر منحصر ہو گا کہ آپ پہلی صدی کے کس یہودی سے سوال کرتے ہیں۔ یہ اصطلاح بذات خود تو بائبل کی اصطلاح ہے اور عموماً یہ اس وقت کے بادشاہ یا سردار کاہن کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ لفظ "مسیح" میں کوئی خاص یا یکتا بات نہیں پائی جاتی تاوقتیکہ آپ یسوع کی زندگی کے زمانہ میں داخل ہوتے ہیں جبکہ بہت سی سیاسی امیدیں اور برائی سے چھٹکارے کی ایک عالمگیر امید اس خاص قسم کی شخصیت پر

مرکوز ہو جاتی ہے ایسی شخصیت جو خدا کا انسانی نمائندہ ہو۔"

سوال: خود یسوع کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا وہ سمجھتے تھے کہ وہی مسیح ہیں؟

جواب: یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ اپنی عوامی زندگی کے شروع میں تو خود یہ اعلان نہیں کر سکتے تھے کہ وہ مسیح ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو اپنی بعثت کے شروع میں ہی صلیب دے دیئے جاتے۔ ایسا تو ہر نبی کے ساتھ ہوا جو خدا کی طرف سے مبعوث ہوا۔ ہمیں **جوزیفس** کی تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یسوع کے بچپن میں گلیلی میں دو ہزار یہودیوں کو صلیب دے دی گئی تھی۔ کیونکہ وہ عنقریب حاصل ہونے والی آزادی کے لئے سرگرم عمل ہونے لگے تھے۔

سوال: دو ہزار؟

جواب: جی ہاں! دو ہزار گلیلی باشندے۔ گلیلی رومن حکومت کی نظروں میں ایک مستقل مشتعل صوبہ کے طور پر بدنام تھا اور یہاں خدا کی بادشاہت کی آمد کے پیش نظر ہمیشہ ایسی تحریکیں ابھرتی رہتی تھیں۔ مجھے "مسیح کی آمد کی امید" کے الفاظ استعمال نہ کرنا چاہئے تھے بلکہ یہ امید کہ "خدا کی بادشاہت کی عنقریب آمد" ہونے والی ہے۔

سوال: یہ وہ پس منظر ہے جس میں یسوع گلیلی کے اس چھوٹے سے گاؤں میں پروان چڑھے ہوں گے۔ اس خوفناک واقعہ کی یاد اور مسیح کی آمد کی توقعات کا چاروں طرف غلغلہ یا کم از کم ایسی مذہبی تحریکیں جنہیں رومی حکومت انقلابی تحریک سمجھتے تھے۔ ان کے ماحول کا حصہ تھیں۔

جواب: بالکل ایسا ہی تھا۔ کیونکہ ہم لازماً مذہب اور سیاست میں امتیاز برت رہے ہیں گو قدیم یہودی ایسا نہیں کرتے تھے اور "خدا کی بادشاہت" کا کم سے کم مطلب ان کے نزدیک اقتدار کا خاتمہ تھا۔

گلیلی جودیہ سے اپنی ایک الگ انفرادیت اور جغرافیائی حیثیت رکھتا تھا وہ بالکل الگ دکھائی دیتا تھا۔ زرخیز، خوبصورت، جگہ جگہ ایک دوسرے سے کافی دور چھوٹے چھوٹے گاؤں اور شہر۔ اس ملک میں مختلف قومیں آباد تھیں۔ سفارس کا یہ شہر جس سے یونانی رنگ عیاں تھا اس میں یہودیوں کا غلبہ تھا لیکن اس میں کافی تعداد میں غیر یہودی بھی تھے جو یا تو یہاں ہی رہتے تھے یا تجارت کی غرض سے یہاں آئے تھے۔ یہودیت گلیلی میں مختلف تھی۔ یروشلم جو کہ علم کا ایک پاکیزہ مرکز تھا اس کے لوگ اس علاقے کے دوسرے کسان یہودیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جن کو وہ غیر مہذب اور بے عمل سمجھتے تھے۔ گلیلی رومی حکومت کے زیر حکومت تھا جو اکثر سخت گیر اور ظالم تھی۔ اگرچہ پورے علاقے میں رومی فوجی دستے موجود رہتے لیکن درحقیقت یہ یہودی حاکم "ہیروڈ اینٹی پاس" جو عظیم ہیروڈ کا بیٹا تھا اس کے براہ راست عملداری میں تھا۔ اس کا دارالخلافہ سفارس تھا۔ یہاں کے آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہودی اور غیر یہودی یہاں مل جل کر پر امن طریق پر ایک شہر میں رہتے تھے۔

جنوبی فلوریڈا، امریکہ کے پروفیسر جم سٹرینج ماہر آثار قدیمہ ہیں۔ وہ سفارس میں آٹھ سال سے کھدائی کا کام کر رہے ہیں۔

سوال: اس بات کے کتنے شواہد موجود ہیں کہ یہاں خود رومی ہی رہتے تھے؟

جواب: درحقیقت ہر چیز جو آپ اپنی آنکھ سے یہاں دیکھیں گے عمارت کے ساتھ سڑک کی پٹڑی سے لے کر ہر ایک چیز میں آپ کو روم کی جھلک نظر آئے گی۔

سوال: اس سے تو یہ ظاہر ہوا کہ رومیوں کے خلاف کوئی زیادہ نفرت نہ تھی۔

جواب: اس خاص شہر میں تو نہیں لیکن گلیلی میں رومی کسان کے خلاف نفرت موجود تھی۔ کیونکہ ہمیں یہاں ان کی بغاوت کے حوالے ملتے ہیں۔ ٹیکس اور دیگر باتوں کے خلاف بغاوت۔

سوال: سفارس کیسی جگہ تھی؟

جواب: ایک وسیع شہر۔ تقریباً ایک مربع میل لمبا۔ یہ حکومتی مرکز تھا جو اردگرد کے گاؤں کی مختلف رنگ میں سرکاری خدمات سرانجام دیتا تھا یہ عدالتی نظام بھی فراہم کرتا تھا۔ پھر یہ ایک کاروباری مرکز بھی تھا یہاں دو خرید و فروخت کے مراکز اور دو منڈیاں تھیں جہاں لوگ خرید و فروخت کے لئے جاتے تھے۔

سوال: سفارس میں کس قسم کے مذہب پر عمل ہوتا تھا؟

یہ یہودی اکثریتی علاقہ تھا جہاں ایک یہودی عبادت خانہ کا ہونا ضروری تھا کیونکہ کتب میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ یہودی شہر ہونے کے علاوہ یہاں ہر مذہب و ملت کے لوگ آباد تھے۔ بلکہ یہ چیز مجھے یہاں دلچسپ معلوم ہوتی ہے کہ جب بھی ہم کسی پبلک جگہ میں کوئی عمارت کھود کر نکالتے ہیں تو پچ کاری کے نقش و نگار میں کوئی خاص مذہبی اثرات نظر نہیں آتے اور ان کا تعلق غیر اہل کتاب دور اور نہ ہی

یہودیوں کے مذہب سے نظر آتا ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ کوئی بھی فریق دوسرے کو آزار نہیں پہچانا چاہتا تھا۔"

سوال: اس جگہ کیا ہے..... وہ گاؤں؟

جواب: یہ ناصرہ ہے۔ یعنی نیا ناصرہ۔

سوال: ہم تو ناصرہ کے واقعی بہت قریب ہیں۔ یسوع تو یہاں باسانی چند گھنٹوں میں پیدل چل کر پہنچ سکتے ہوں گے۔

جواب: جی ہاں' زیادہ سے زیادہ دو گھنٹہ میں! ہمارے لوگوں کو اتنا ہی وقت لگتا ہے۔

سوال: اگر وہ یہاں کھانا اور دیگر ضرویات کی چیزیں لینے کے لئے آتے ہوں گے تو انہیں کون سی زبان بولنی پڑتی تھی۔

جواب: یونانی ان میں سے ایک زبان ہے جو وہ شاید جانتے تھے۔ گھروں میں تو لوگ پہلے سے ہی آرامی زبانی بولتے تھے اور جب ہمیں یہاں کہیں کچھ لکھا ہوا نظر آئے جیساکہ اس منزل پر ہے تو وہ یونانی میں ہی ہوتا ہے۔

سوال: تو یسوع کے لئے یونانی زبان میں شدھ بدھ رکھنی ضروری ہو گی؟

جواب: بالکل' کم از کم اتنی کہ وہ سیاست یا کسی موضوع پر گفتگو کر سکیں یعنی یونانی زبان پر عبور حاصل کرنا لازم نہ تھا مگر انہیں کچھ نہ کچھ یونانی زبان تو آنا لازم تھا۔

سوال: میں تو اس بات کو بہت غیر معمولی سمجھتا ہوں کہ یہ عظیم جگہ گویا ناصرہ کی دہلیز پر واقع ہے مگر اناجیل میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

جواب: بایں ہمہ یہ شہر یسوع کے لئے موزوں نہ ہو گا یعنی یہاں پر ان کی کوئی پذیرائی نہ ہوئی ہو گی۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا وہ اس جگہ سے دھتکار کر نکالے تو نہیں گئے تھے؟

جواب: زیادہ ممکن یہی ہے۔ میرے خیال میں یہ بھی درست ہے اس لئے کہ رومی تمدن میں نظم و ضبط کو ہی سب کچھ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں ایک ایسا شخص ہے جس کے آنے سے فسادات بھڑکنے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ اگر میں بھی اس شہر کے لیڈروں میں یعنی "آرکونس ARCONS میں سے ہوتی تو ان پر ضرور کڑی نگاہ رکھتی۔

سوال: سائمن' پیٹر اور اینڈریو یسوع کے تین قریب ترین حواری تھے جن کا تعلق بیت حسدہ سے تھا' یہ کیسی جگہ تھی؟

جواب: قدیم ماخذوں کے مطالعہ سے خیال تھا کہ یہ کوئی بہت شاندار جگہ ہو گی جسے فلپ ہیرڈ نے بطور اپنے دارالخلافہ کے تعمیر کرایا تھا لیکن آثار قدیمہ کے انکشافات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بڑی خستہ حال جگہ ہے۔ جب میں پہلی مرتبہ وہاں گیا تو ایسا لگا کہ مجھ پر بجلی گر گئی کیونکہ وہاں زمین پر انسانوں کی بنائی ہوئی کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کو مطالعہ کی بنیاد بنایا جا سکتا۔ جو پتھر وہاں موجود بھی تھے جن سے چیزیں بنائی گئی تھیں وہ ان تراشے تھے۔

سوال: تو گویا یہ صورت حال اس آیت کو کہ "مبارک ہیں وہ جو غریب ہیں" ایک نیا مفہوم عطا کرتی ہے؟

جواب: ہاں میرے خیال میں ایسا ہی ہے جب میں مٹی کو اپنے ہاتھوں سے کھود رہی تھی کہ شاید کوئی شیشہ ہی ہاتھ آ جائے تاکہ جانچ سکوں کہ وہ لوگ کس قسم کا شیشہ استعمال کرتے تھے مگر مجھے کچھ بھی نہ ملا۔

سوال: تو گویا "سفارس" SPHARIS میں بالکل کوئی شیشہ نہ تھا؟ حالانکہ اب تو یہاں کھڑکیوں میں خوبصورت شیشے لگے ہوئے ہیں اور شیشے کے پیالے ملتے ہیں۔

جواب: یہ درست ہے۔ ہمیں تو صرف ایک ماہی گیروں کا گاؤں ملا اور وہاں وہ اپنا سودا جو کہ مچھلی تھی فروخت کر رہے تھے اور میں انہیں الزام نہیں دیتی کہ کیوں وہ یہ سب کچھ چھوڑ کر ایک سیلانی "ربائی" (یہودی عالم) کے ساتھ شامل نہ ہوئے۔

سوال: بیت حسدہ سے یسوع کے ماننے والوں کی غربت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پیٹر کے گھر کے فرش پر سے مچھلی پکڑنے کے کانٹے اور جال میں لگانے والے وزن برآمد ہوئے اور کوپرنیم CAPERNIUM سے جہاں سینٹ فرانسس کی یاد میں گرجے کی عمارت اس طریق پر کھڑی ہے گویا پہلی صدی کی عمارت کے کھنڈرات پر ایک بہت بڑا پرندہ بیٹھا ہوا ہو۔ یہ سائمن پیٹر کی ملکیت سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس گھر میں حضرت مسیح کی رہائش بھی رہی۔

بعثت کے شروع میں حضرت مسیح کا سب سے پہلا کام جس کا ذکر انجیلوں میں ملتا ہے یہ تھا کہ انہوں نے کوپرنیم کے یہودی معبد خانہ میں تبلیغ کی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں یسوع نے بدروحیں نکالیں اور مریضوں کو اچھا کیا۔

(جاری ہے)

ایک علمی مقالہ

قرآن مجید میں تدبر کی وسعت-۱

قرآن مجید ایک ابدی کتاب اور عالمگیر شریعت ہے' جبکہ اس سے پہلے کے جتنے الہٰی صحیفے موجود ہیں وہ کسی خاص قوم یا حصہ ملک کی ایک خاص حد اور وقت تک کی اصلاح و تربیت کے لئے تھے۔ زرتشت کے روحانی آتش کدے نے صرف ایرانیوں کو روحانی گرمی پہنچائی۔ ویدوں کا خطاب صرف بھارت ورش کو ایک محدود مکتی کا راستہ بتانے کے لئے تھا۔ بدھ نے نروان کا راستہ بھی صرف ایک خاص طبقے ہی کو بتایا۔ کنفیوشس صرف چین کے پیغمبر تھے۔ موسیٰؑ بنی اسرائیل کے قومی خدا ہی کو پیش کرتے رہے۔ حضرت مسیح ناصریؑ محض بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی رستگاری کے لئے آئے تھے اور انہوں نے اپنے حواریوں کو صاف صاف حکم دیا تھا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا کیونکہ میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا..... لڑکوں کی روٹی کتوں کے آگے ڈال دینا اچھی بات نہیں (متی ۱۵:۲۴)۔ یہی حال دوسرے آسمانی صحیفوں کا ہے۔

لیکن قرآن مجید اور نبیوں کے سردار سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا خطاب پوری انسانیت کے لئے ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں نبی اکرمؐ کی زبان سے کہا گیا ہے: **انی رسول اللہ الیکم جمیعا (الاعراف ۷:۱۵۸)** "اے بنی نوع انسان میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ یوں ہر عامی و عالم اس کا مخاطب ہے اور ہر علمی اور دینی سطح کا انسان اس سے فیضیاب ہو سکتا ہے اور ہر رتبہ اور طبقہ کے لوگ اس سے ہدایت پا سکتے ہیں اور ہر استعداد کی تکمیل کا سامان اس میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کسی خاص قوم کی برتری اور اس کے مخصوص حصوں کا مدعی نہیں اور نہ اس کے اندر ایسے اصول ایمان و نجات اور نظریات ہیں جن کو انسانی ذہن سمجھ ہی نہ سکے اور جو اس میں سما ہی نہ سکیں۔ بلکہ وہ تمام قوموں اور ہر اسود و احمر کو برابر کا درجہ دیتا' سب کو یکساں حقوق عطا کرتا اور ایک بین الاقوامی مذہب پیش کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے مختلف پہلوؤں سے آسان بنایا گیا ہے۔ جیسے فرمایا **و لقد یسرنا القران للذکر فھل من مدکر (القمر ۵۴:۱۷)**۔ ہم نے وعظ و نصیحت اور عظمت و برتری کے لئے یہ قرآن آسان بنایا ہے۔ یقیناً بہت سے لوگ اس سے فائدہ حاصل کریں گے اور یوں ایک معمولی سے معمولی سمجھ کا انسان بھی اس سے فیضیاب ہو سکتا ہے۔ اس میں ایک برابر تین اور تین برابر ایک سے دور از کار اور بعید از فہم و فراست مسائل اور الہٰی اسرار پیش نہیں کئے گئے۔ اس کا اسلوب بیان بالکل آسان ہے اور اس کی زبان اپنے مطالب کو خوب واضح کرنے والی ہے۔ اس میں کوئی ابہام اور گنجلک نہیں۔ پھر قرآن کا خطاب فطرت انسانی سے ہے۔ وہ گویا کوئی نئی چیز پیش نہیں کرتا بلکہ انسان کے بھولے ہوئے سبق ہی یاد دلاتا ہے اور سوئے ہوئے کی بیداری کا موجب بنتا ہے۔ اس چیز نے اسے تقریر کی وہ لذت بخشی ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے ہر سلیم الفطرت انسان یہی سمجھتا ہے کہ اس کے دل کی بات کی جا رہی ہے۔

پھر سنت و تعامل نے اسے بالکل سہل بنا دیا ہے اور یوں اس کی گفتنی باتیں کردنی کے پیرائے میں آ کر واضح ہو گئی ہیں اور کوئی عملی مشکل باقی نہیں رہی۔ از بس کہ اس کے تمام احکام کامل طور پر سلسلہ تعامل و سنت میں ڈھل گئے ہیں اس لئے وضاحت کا کامل نور اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور جس قدر اور جس مرتبہ تکمیل تک کوئی حکم سلسلہ تعامل سے فیضیاب ہوا ہے۔ اسی قدر ثبوت یقین اور وضاحت کے نور سے روشن ہو گیا ہے۔

پھر قرآن مجید اپنے اندر معنی و تعبیر کی ایک ایسی نئی شان رکھتا ہے جو اپنے اپنے دور کے تقاضوں پر پوری اترتی ہے اور واقعاتی رنگ میں سامنے آ کر ہر شخص کے فہم میں آ جاتی ہے۔ یہ **و لقد یسرنا القران للذکر** ہی کی جلوہ گری ہے۔

پھر قرآن مجید عمل کے لئے بالکل سہل ہے۔ اس میں دل و دماغ کو سکھا دینے اور متعفن کر دینے والی دشوار ریاضتیں' جنگلوں اور بنوں میں مارے مارے پھرنے اور قویٰ کو شل اور ذہنوں کو مفلوج کر دینے والی تپسیائیں اور مشقتیں نہیں ہیں' جن کا نمونہ ہمیں یوگ میں ملتا

ہے۔

پھر قرآن مجید میں عبادات' معاملات اور اخلاق کا سہل نظام پیش کیا گیا ہے' جن پر عمل پیرا ہونے میں کوئی الجھن اور دشواری پیدا نہیں ہوتی اور کسی متنفس پر اس کی استعداد سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالا گیا جیسے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا** (البقرہ ۲:۲۸۶) اور حصول نجات کی سب راہیں اس میں روشن کردی گئی ہیں۔

پھر قرآن مجید وہ یقینی' کامل اور آسان ترین ذریعہ ہے جس سے کسی تکلیف مالایطاق اور لاطائل مشقت کے بغیر اور بلا مزاحمت شکوک و شبہات نجات کے صحیح اصول مع دلائل معلوم ہو سکتے ہیں۔ پھر عقائد صحیحہ کی شناخت کا یہ آسان ترین ذریعہ ہے۔ وہ باریک سے باریک استدلال کو منطقیانہ اور فلسفیانہ مصطلحات اور موشگافیوں سے پاک کر کے نہایت سہل اور آسان الفاظ و انداز میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ ایک فلسفی اور عامی دونوں اپنی اپنی استعداد اور ذوق کے مطابق یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے دلائل ایسے سریع الفہم ہیں کہ فوراً دل میں اتر جاتے ہیں۔ منطق کے مقدمات' صغریٰ و کبریٰ کے چکر' مصطلحات کی بھول بھلیوں اور مغالطوں سے اس کا دامن استدلال بالکل مبرا ہے۔ اس نے اظہار کے پر پیچ طریقوں سے جادو نہیں جگایا۔ اس کے محکمات بنیادی' مطالب غیر مبدل' مقاصد واضح اور عالمگیر ہیں۔ زمان و مکان کی تبدیلی ان پر اثرانداز نہیں ہوتی۔ ان سے نہایت آسانی کے ساتھ مستفید ہوا جا سکتا ہے اور جنہیں ہر شخص جو اس کی زبان سے واقف ہے نہایت سہولت سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کے الفاظ نامانوس نہیں اور نہ عبارتیں ہی پیچیدہ ہیں۔ قواعد صرف و نحو یا گرامر اور محاورہ زبان کی اس میں مخالفت نہیں۔ مشکل استعارات' دور از کار تلمیحات' بعید از فہم تشبیہات اور کنایات سے مبرا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب انسان سے کلام کیا ہے تو یہ کلام انسان کی زبان ہی میں کیا ہے تاکہ اس کی سمجھ میں آجائے۔ اس لئے فرمایا **وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لھم** (ابراہیم ۱۴:۴)۔ ہر رسول کو اس کا پیغام اس کی قوم کی زبان ہی میں دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کے پیغام کے لئے جو زبان اختیار کی گئی ہے وہ کوئی مردہ زبان نہیں کہ اس کے سمجھنے والے ہی دنیا سے ناپید ہو چکے ہوں' نہ اس میں ایسی تبدیلیاں ہی راہ پا سکی ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ چوسر اور شیکسپئر کی زبان کی طرح کہنگی کا شکار ہو گئی ہے بلکہ اس کے لئے زبان بھی **عربی مبین** اختیار کی گئی (الشعراء ۲۶:۱۹۵)۔ جو ایک زندہ زبان ہے اور اپنی ذات میں بھی آسان ہے اور بوجہ ام الالسنہ ہونے کے دنیا کی تمام زبانوں کے ساتھ اسے یک گونہ مناسبت اور ربط ہے۔ وہ مردہ زبان نہیں جسے بولنے' لکھنے اور سمجھنے اور استعمال کرنے والے دنیا میں نہ پائے جاتے ہوں یا جس پر چند ایک لوگوں ہی کی اجارہ داری ہو۔ یہ **تعقیدات** لفظی و معنوی سے پاک ہے۔ اس کا اطراد مواد بہت ہی مختصر اور سادہ ہے۔ کل ڈیڑھ ہزار مادہ اس میں استعمال ہوا ہے جسے کچھ وقت صرف کر کے یاد کر لیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید کے اوامر و نواہی پر عمل پیرا ہونا بہت ہی سہل ہے کیونکہ یہ کوئی کلیہ نہیں پیش کرتا اور اس نے صرف احکام ہی نہیں دیئے بلکہ اپنے احکام کے ساتھ اس کے مصالح اور حکمتیں بھی بتا دی ہیں اور یوں ان کی بجاآوری مشکل نہیں رہتی کیونکہ یہ ایک طبعی بات ہے کہ جب کسی حکم کی حکمت' اس کا مقصد' اس کے بجالانے کے فوائد' اس سے پہلوتہی کے نقصانات بھی بیان کر دیئے جائیں تو اس حکم کا ماننا محض آمریت کے مقابلے میں آسان ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید اس جہت سے بھی آسان ہے کہ اس میں دین و ایمان میں کسی امر کا اخفا نہیں کیا گیا۔ معتقدات کی سب باتیں صاف صاف بیان فرما دی ہیں اور اصول نجات بہت سادہ ہیں جن کے ماننے اور معلوم کرنے کے لئے کسی طرح کی دقت اور ابہام نہیں۔

قرآن مجید اس حوالے سے بھی آسان ہے کہ یہ انسان کی فطرت کی آواز ہے اور اس کے پورے نظام کا بیج اس کی فطرت میں موجود ہے (الروم ۳۰:۳۰)۔ اسی وجہ سے قرآن مجید کا ایک نام **الذکر** بھی ہے (الحجر ۱۵:۹) یعنی فطرت انسانی میں مرکوز اور موجود باتوں کو یاد دلانے والا۔ چنانچہ قرآن مجید کی جس آیت میں اس کے سہل ہونے کا ذکر ہے اور جس کی تشریح ان سطور میں ہم کر رہے ہیں اس میں بھی اس کی اس صفت **ذکر** ہی کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس صفت کا یہاں ذکر بے وجہ نہیں بلکہ اس میں اسی نکتہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

دراصل قرآن مجید ذوالوجوہ اور ذوالمعانی ہے' جیسا کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے کئی بطون ہیں۔ اسے جس عقل و فہم کا شخص بھی پڑھے اسے اس میں اس کی سمجھ اور استعداد کے مطابق تعلیم و تربیت کا سامان مل جائے گا۔ اگر معمولی سمجھ بوجھ کا شخص اسے پڑھے تو وہ اس میں ایسی تعلیم دیکھے گا جس کا ماننا اور سمجھنا اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہ ہو گا۔ اگر متوسط استعداد کا آدمی اسے

پڑھے گا تو وہ اپنے علم و فہم کے مطابق اس سے مضامین اخذ کرے گا اگر ایک دانشور' فلاسفر اور اعلیٰ درجے کا تعلیم یافتہ اس کا مطالعہ کرے گا تو اس کی ذہنی اور علمی تشفی کا سامان اسے اس میں ملے گا۔

اس کے الفاظ و آیات میں ایسی جامعیت ہے کہ ابتدائی راہبری کا سامان بھی پیش کرتی ہے اور انسان کی تمام طبعی' اخلاقی اور روحانی حالتوں کی بالیدگی کا سامان بھی اس میں موجود ہے۔ یہ **ھدی للناس** بھی ہے (البقرہ ۲:۱۸۵) اور **ھدی للمتقین** بھی (البقرہ ۲:۲)۔ عوام الناس کے لئے اس کا لہجہ اور بات کہنے کا انداز ایسا ہے جو عام فہم اور دلآویز ہی نہیں بلکہ ان فطری حالتوں اور حاجتوں کے قریب اور مطابق ہے جن سے عوام مانوس ہیں اور جو وہ کہتا ہے وہ اس کے دل کی دھڑکن اور فطرت کی آواز سے ہم آہنگ ہے۔

پھر اسلوب و بیان کی مکمل اثر آفرینی اور حسن کاری اس میں موجود ہے اور یوں یہ انسان کے دل و دماغ دونوں پر دستک دیتا ہے اور نفس **مطمئنہ** کی سروسامانی تو صرف اسی میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے تو فرمایا ہے **و ان من شی الا عندنا خزائنہ و ما ننزلہ الا بقدر معلوم** (الحجر ۱۵:۲۱) کہ ہر شخص کے لئے جس جس چیز کی بھی ضرورت ہے اس کے خزانے اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں اور ہر ایک کو بقدر ظرف و ضرورت اس میں سے حصہ ملتا رہتا ہے۔

غرض قرآن مجید کی عظمت کا ایک کمال اس کا کمال تفہیم ہے۔ اگر کوئی عامی ہے تو اپنی موٹی سمجھ کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اگر عالم' دانا اور بینا ہے تو اپنے دقیق خیالی اور بلند علم کے موافق اس سے بالیدگی حاصل کر سکتا ہے۔ پست سے پست اور غیر متمدن سے غیر متمدن افراد و اقوام سے لے کر بام عروج پر پہنچی ہوئی قومیں اور افراد تک کے لئے اس میں تعلیم و تلقین کا ذخیرہ موجود ہے اور یہی چیز اسے محل تدبر بناتی ہے۔

کسی ساکت و صامت تالاب میں اگر ایک کنکر پھینکا جائے تو اس کے مرکز سے ابھر کر یکے بعد دیگرے گولائی میں لہریں پھیلتی چلی جاتی ہیں اور جیسے جیسے لہروں کا ایک دائرہ آگے بڑھتا ہے اس مرکز سے دوسرا دائرہ پیدا ہو جاتا ہے اور جتنی شدت اس کنکر کی ضرب اور زیادتی اس کے حجم میں ہو گی اتنے ہی دائرے زیادہ تعداد و بلند تر انداز میں پیدا ہوں گے۔ اسی طرح **تدبر فی القران** کی ضرب سے قرآنی حروف' الفاظ اور آیات کی مرکز سے انسان کے ساکت ذہن پر معانی و مطالب کی لہروں کے ابھار پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے مطالب کے دائروں کی وسعت' بلندی اور تعداد کو محدود نہیں کیا جا سکتا ان کا انحصار ہر شخص کی ضرب و ضرورت اور ظرف پر ہے۔ ضرورت توجہ' کوشش' محنت' ریاضت اور جدوجہد کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے **والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا** (العنکبوت ۲۹:۶۹) کہ جو شخص بھی ہماری راہوں میں جدوجہد کرے گا ہم اپنی راہیں اس کے لئے روشن کرتے چلے جائیں گے۔ اس مضمون کو ابن عباسؓ کی حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے **القران ذو شجون و فنون و بطون لا تنفض عجائبہ** کہ قرآن میں علم و فہم کے بے حد و حساب پہلو ہیں اور اس کے عجائب کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ علامہ آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) نے اپنے محدود پیرائے بیان میں لکھا ہے **لکل ایة ستون الف فھم** (البرہان ۱:۴۵۴) کہ قرآن مجید کی ایک ایک آیت میں علم و فہم کے ستر ہزار پہلو ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سورۃ فاتحہ کی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **لو اردت ان املی وقر بعیر علی الفاتحة لفعلت** کہ اگر میں سورۃ فاتحہ کی ایسی تفسیر لکھنا چاہوں جس کے مسودات کا پھیلاؤ اور حجم اتنا ہو کہ ایک اونٹ کے اٹھانے کے بوجھ کے برابر ہو تو میں ایسا کر سکتا ہوں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے قرآن مجید کو **قبة علم الاولین والاخرین** قرار دیا ہے۔ اس لئے علامہ زرکشی اور امام غزالی نے لکھا ہے کہ **کل علم متنوع من القران** (البرہان ۱:۸) کہ ہر طرح کا علم قرآن مجید سے مستنبط ہے۔ سہیل بن عبداللہ فرماتے ہیں **لو اعطی العبد لکل حرف من القران الف فھم لم یبلغ نھایة ما اد وعة اللہ فی ایة من کتابه** کہ اگر کسی شخص کو قرآن مجید کے ایک حرف کے ہزار ہزار مطالب پر بھی دسترس ہو تو باری تعالیٰ نے جو علوم و معارف قرآن مجید کی ایک ایک آیت میں ودیعت فرما رکھے ہیں وہ سب تک نہیں پہنچ سکتا۔ راڈویل نے لکھا ہے کہ قرآن مجید اعلیٰ و ارفع تعلیم سے پر ہے۔ اس میں علم و آگہی کے جو نکات بیان کئے گئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی بنیاد پر بڑے بڑے طاقتور ملک اور جلیل القدر سلطنتیں قائم کی جا سکتی ہیں۔

یہ بیانات کسی مبالغہ آرائی پر مبنی نہیں بلکہ ان میں یہی نکتہ مرکوز ہے کہ ہر پست سے پست اور بلند سے بلند انسان اپنی اپنی سمجھ کے مطابق قرآن مجید سے استفادہ کر سکتا ہے۔

تیسیر کے معنی لغت میں نرمی اور فرمانبرداری کے بھی ہیں۔ اسی سے **تیسیر** کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو کسی مقصد کے

حصول کے لئے بالکل موزوں' درست' موافق اور سازگار بنا دینا یعنی جس چیز سے جو کام لینا ہے یا اس سے جو مقصد حاصل کرنا ہے اس مقصد کے لئے اسے اس قدر سازگار اور مناسب بنا دینا کہ جب کوئی شخص اس سے وہ مقصد حاصل کرنا چاہے تو آسان سے آسان' بہتر سے بہتر اور موزوں سے موزوں طریق پر حاصل کر سکے۔ یہاں تک کہ اس مدعا کے حاصل کرنے کے لئے اس سے اقرب اور آسان تر کوئی دوسری راہ نہ ہو۔ یہی **اھد نا الصراط المستقیم** کی دعا کا مفہوم ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ آسان اور سادہ ہونا بھی ایک نسبتی امر ہے۔ ایک کسان جو کھیت میں ہل چلاتا ہے' یا مزدور دن بھر ٹوکری اٹھاتا ہے وہ بھی فکر و نظر سے کام لیتا ہے۔ اسی طرح ایک فلسفی اور حکیم اور سائنس دان جو خواص اشیاء پر کام کرتا اور کائنات کی گتھیاں سلجھاتا ہے وہ بھی فکر و نظر کرتا ہے لیکن دونوں کے فکر و نظر میں کتنا فرق ہے۔ ایک معمولی انسان کے فکر و نظر کی آخری حد سے ایک حکیم کے فکر و نظر کا پہلا قدم بھی اس سے منزلوں آگے پڑتا ہے اور ایک حکیم کے فکر و نظر کے جو مبادی ہیں وہ عامیوں کے تمام علم و ادراک کی آخری حدوں سے بھی آگے ہے۔

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قرآن مجید کا سہل اور آسان ہونا اس حوالے سے بھی ہے کہ **القران یفسر بعضہ بعضا** کہ قرآن آپ اپنی تفسیر ہے اور اس کا ایک حصہ دوسرے کا شارح ہے۔

قرآن مجید میں ایک بات کہیں اجمال سے آتی ہے کہیں تفصیل سے' کہیں اختصاراً صرف دعویٰ کی شکل میں کہیں تفصیلا" دلیل کے ساتھ۔ ایک جگہ اگر کسی چیز کا نظم و ربط واضح نہیں تو دوسری جگہ وہ واضح ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ الفاظ' اسالیب' محاورات اور تمثیلات تک کی مشکلات مختلف سورتوں میں بار بار نمایاں ہونے کی وجہ سے حل ہو جاتی ہیں۔ دراصل قرآن مجید کی ہر آیت دوسری آیات سے ایک عقلی اور علمی سہارا لیتی ہے اور خود دوسری آیات کے لئے ایسا ہی سہارا مہیا کرتی ہے۔ لہٰذا اگر اس کی کسی آیت کا کوئی ایک تصور بھی مسخ کیا جائے یا اسے غلط سمجھا جائے یا اس کی نادرست توجیہہ کی جائے تو دوسری آیات اس کی تغلیط کر دیں گی۔ یوں یہ ممکن ہی نہیں کہ دوسری آیات سے تصادم لئے بغیر قرآن مجید کی کسی آیت کی بھی غلط تعبیر کی جا سکے۔ قرآن مجید اپنے اس کمال میں منفرد ہے۔ دراصل قرآن مجید سے دین اسلام کا ایک مربوط اعتقادی' علمی اور عملی نظام وجود میں آتا ہے اور اس میں ایک ایسی نظم و ربط ہے کہ اس کی کسی ایک اینٹ کو بھی اس کی اصل جگہ سے سرکایا نہیں جا سکتا۔ یوں تمام مقامات کو بیک وقت سامنے لانے سے ان الفاظ کا حقیقی اور قطعی مفہوم نمایاں طور پر سامنے آ جاتا ہے۔

قرآن مجید نے خود اپنی اس خصوصیت کی طرف توجہ دلائی ہے اور اپنی ایک صفت **کتبا متشابھا مثانی** بیان کی ہے' جیسے فرمایا: **اللہ نزل احسن الحدیث کتبا متشابھا مثانی** (الزمر۳۹:۲۳) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ذریعہ بہترین کلام اتارا ہے یعنی ایسی کتاب جس کے مضامین باہم ملتے جلتے ہیں اور دہرائے گئے ہیں۔ اس کا ایک حصہ دوسرے کے مشابہہ اور اس کی مثل ہے۔ اس کے فوائد اور مضامین بار بار اور ازسرنو تازہ ہوتے رہیں گے۔ قرآن مجید ہی میں ایک دوسری جگہ اس مضمون کو تصریف آیات سے تعبیر کیا ہے' جیسے فرمایا: **انظر کیف نصرف الایت لعلھم یفقھون** (الانعام ۶:۶۵) دیکھو! ہم کس طرح اپنی آیات کو بدل بدل کر اور بار بار بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ تفقہ سے کام لیں۔ مطلب وہی ہے کہ قرآن مجید نے اپنے مطالب کو مختلف اسلوبوں اور مختلف دلیلوں سے بیان کیا ہے اور ایک ہی حقیقت کو اس کے مختلف پہلوؤں سے واضح کیا ہے اور ہر چیز تفہیم و تفقہ کا ایک ذریعہ ہے۔ قرآن مجید کا یہ وہ مخصوص انداز ہے جس سے اس کے مطالب میں توضیح و تعیین پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے مقاصد و مضامین نکھر کر سامنے آ جاتے ہیں اور صحیح مفہوم کے اخذ کرنے میں کوئی دقت نہیں رہتی۔

یہ آیات بتاتی ہیں کہ فہم قرآن اور تسہیل قرآن کا ایک ذریعہ خود قرآن مجید ہے۔ اسے مفسرین کی اصطلاح میں تصریف آیات کہتے ہیں۔ یعنی آیات و مطالب کو مختلف مقامات پر لوٹا کر لانا۔ اس سے اگر وہ تمام آیات بیک وقت سامنے رکھی جائیں جن میں کوئی مشترک اور ملتا جلتا مضمون بیان ہوا ہے تو کسی بے راہ روی کا امکان نہیں رہتا۔ ایک ہی بات جب گوناگوں پہلوؤں سے سامنے آئے گی تو اگر وہ ایک جگہ سمجھ نہ آئی ہو تو دوسری یا تیسری جگہ سمجھ میں آ جاتی ہے اور اگر کسی بات کے کسی پہلو کی وضاحت ہمارے سامنے نہیں ہوئی تو دوسری یا تیسری جگہ کسی اور سیاق و سباق میں وہ واضح ہو جاتی ہے۔

ایک مجاہد کا تعارف

ترتیب: ناصر احمد

ہمارے نہایت محترم بھائی عبد الرزاق صاحب
بانی دار الاشاعت کتب اسلامیہ، بمبئی

آپ ۴ فروری ۱۹۲۷ء میں بمبئی پریذیڈینسی ضلع شمالی کنارہ کے قصبہ حلیال میں پیدا ہوئے۔ ساتویں جماعت تک اسی قصبہ میں تعلیم حاصل کی۔ میٹرک حلیال سے ۲۰ میل دور دھاواڑ سے کیا۔ مختلف جگہوں پر پرائیویٹ ملازمت کرتے رہے۔ ریاست حیدر آباد میں ۱۹۴۸ء کے پولیس ایکشن کے بعد بمبئی ہجرت کر گئے۔ ایک سال تک ایک راشن ڈپو میں ملازمت کی اور آخر کار رچرڈسن اینڈ کروڈس کمپنی' بمبئی جو کہ 'جے' جے' ہسپتال کے قریب تھی بطور اپرنٹس ملازمت اختیار کرلی۔ ملازمت کے دوران والشائن نامی ایک عیسائی مبلغ انہیں تبلیغ کرتے رہتے اور آپ جتنا کچھ جانتے تھے اس کی بناء پر اسلام اور رسول اکرم صلعم کے خلاف اعتراضات اور الزامات کو رد کیا کرتے تھے لیکن دل میں جوابات کے متعلق پوری طرح تسلی نہ ہوتی۔ انہوں نے پرائمری تعلیم کے دوران صرف کناڈا زبان اور پھر میٹرک تک انگریزی زبان پڑھی تھی۔ اگرچہ ان کی مادری زبان اردو تھی لیکن انہیں تعلیم کے دوران اردو کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا اس لئے اسلام کے متعلق مطالعہ کرنے کے لئے وہ ہمیشہ انگریزی کی کتابیں ڈھونڈتے رہتے۔ ان دنوں انگریزی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں اسلام پر لٹریچر مشکل سے ملتا تھا۔ اس بارے میں انہوں نے اپنے کئی دوستوں سے مشورہ کیا لیکن وہ بھی اس سلسلہ میں ان کی کوئی خاص رہنمائی نہ کر سکے۔ بالآخر ان کے ایک رشتہ دار نے مشورہ دیا کہ اسلام کے مطالعہ کے لئے انہیں اردو زبان سیکھنی چاہئے۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ احمدی جماعت نے اسلام اور عیسائیت پر انگریزی میں تبلیغ کی غرض سے کافی کتابیں اور کتابچے شائع کئے ہیں۔ اسی دوران یہ خبر آئی کہ پاکستان میں احمدیوں کے خلاف فسادات ہو رہے ہیں اور اس کی تفصیلات ٹائمز آف انڈیا میں پڑھنے کا انہیں موقع ملا کیونکہ وہ اس اخبار کو باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ ان تفصیلات میں انہیں اس جماعت کے عقائد اور علمی کارناموں کا بھی علم ہوا۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم و مغفور کے انگریزی ترجمۃ القرآن کا ذکر بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس ترجمہ کی بلند پایہ علمیت اور گہرے مطالعہ کی بے حد تعریف کی گئی تھی۔ چنانچہ انہیں اس ترجمہ کو پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ جن دنوں محترم رزاق صاحب اس ترجمہ کی تلاش میں تھے انہوں نے اخبار میں ایک انگریزی ترجمۃ القرآن کا اشتہار اخبار بساونگوڈی' بنگلور میں پڑھا۔ یہ ترجمہ ایک انگریز نومسلم محمد مارماڈیوک پکھتال کا تھا۔ انہوں نے فوراً" اس ترجمہ کو خرید لیا اور اسے مکمل طور پر پڑھا لیکن اسلام کے صحیح فہم کے متعلق ان کی تسلی نہ ہوئی۔ اب وہ نہایت بے چینی سے حضرت مولانا محمد علی مرحوم و مغفور کے انگریزی ترجمہ کی تلاش کرنے لگے۔ ان دنوں کمپنی نے انہیں ایک پراجیکٹ کی تکمیل کے سلسلہ میں جبل پور بھیج دیا۔ ایک دن جبکہ وہ کتابوں کی ایک دکان میں کتابیں دیکھ رہے تھے تو ان کی نظر تحریک خلافت کے مشہور رہنما مولانا محمد علی جوہر کی کتاب "مائی لائف اے فریگمنٹ" یعنی میری زندگی کا ایک ٹکڑا پر پڑی۔ اس کتاب میں انہوں نے حضرت مولانا محمد علی مرحوم و مغفور کے انگریزی ترجمۃ القرآن کے بارے میں تفصیل سے نہایت شاندار تعریفی کلمات لکھے تھے۔ اس کے بعد سے اس قرآن مجید کے ترجمہ کی تلاش کے لئے گویا ان کو جنون سا ہو گیا۔ انہوں نے اس ترجمہ کو حاصل کرنے کی کوششیں تیز کر دیں اور ساتھ ساتھ دعا بھی کرتے رہے کہ کسی طرح اس ترجمہ کی ایک جھلک ان کو دیکھنا نصیب ہو جائے۔ جبل پور میں ان کا کام ختم ہوا تو وہ واپس بمبئی آگئے اور انہوں نے قرآن مجید کے اس ترجمہ کی تلاش کو جاری رکھا۔ جب ترجمہ کے حصول کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ بمبئی میں احمدیہ جماعت کے مرکز جائیں کیونکہ کسی نے ان کو بتایا تھا کہ مولانا محمد علی کا تعلق احمدیہ

جماعت سے ہے۔ اس وقت چونکہ انہیں مسلمان علماء سے گفتگو کرنے کا اتنا سلیقہ نہ آتا تھا اس لئے وہ اپنے ساتھ اپنے چند دوست لے گئے۔ چنانچہ ان کی ملاقات بمبئی میں قادیانی مرکز کے انچارج مولانا شریف احمد امینی سے ہوئی۔ بدقسمتی سے اس ملاقات کے دوران میں حضرت مولانا محمد علی صاحب کے انگریزی ترجمۃ القرآن کے بارے مطلوبہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں کیونکہ ان کے دوستوں میں سے ایک شخص جو دیوبندی خیال کا تھا اس کی امینی صاحب سے گرما گرم بحث شروع ہو گئی اور بالآخر نوبت لڑائی تک پہنچ گئی۔ چنانچہ محترم رزاق صاحب مایوس اور پریشان واپس لوٹے۔ تین چار دن کے بعد انہوں نے پھر ہمت کی اور اکیلے ان کو ملنے چلے گئے اور ان سے گذشتہ واقعہ پر افسوس کا اظہار کیا جب ان کے دوست نے درشت کلامی اور غیر ذمہ داری کا رویہ اختیار کیا تھا۔ امینی صاحب نے انہیں بتایا کہ انہیں معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ غیر احمدی لوگ اور مولوی صاحبان اکثر ایسا کرتے رہتے ہیں۔ تب انہوں نے ان سے اپنے آنے کی غرض بتائی کہ انہیں حضرت مولانا محمد علی کے انگریزی ترجمۃ القرآن کی ایک کاپی حاصل کرنا ہے۔ امینی صاحب نے انہیں بتایا کہ مولانا محمد علی صاحب کا ان کی جماعت سے کوئی تعلق نہیں اس لئے وہ اس ترجمہ کو حاصل کرنے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے البتہ انہوں نے مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب کے انگریزی ترجمہ کی ایک کاپی تحفتہً پیش کی۔ لیکن رزاق صاحب نے اسے لینے سے انکار کر دیا کیونکہ انہیں تو حضرت مولانا محمد علی کے انگریزی ترجمۃ القرآن کی تلاش تھی۔ رزاق صاحب نے ان سے درخواست کی کہ وہ کم از کم اس جگہ کا پتہ تو بتا دیں جہاں سے وہ ترجمہ حاصل کر سکیں۔ آخر کافی لیت و لعل کے بعد انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ احمدیہ بلڈنگس، لاہور کے پتہ پر خط لکھیں۔ رزاق صاحب نے امینی صاحب کو کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ انہیں اس ترجمہ کو حاصل کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ جو پتہ آپ نے دیا ہے وہ نامکمل ہے اور انہیں یقین ہے کہ اس پتہ پر خط کبھی نہ پہنچے گا۔ بہرحال نہایت بے دلی سے انہوں نے ایک پوسٹ کارڈ اس پتہ پر لکھ دیا اور پھر اسے بھول گئے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ کارڈ کبھی اس پتہ پر نہ پہنچ پائے گا۔ لیکن ایک دن جب آپ کام سے گھر واپس آئے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ان کی بیوی نے انہیں بتایا کہ کتابوں کا ایک پیکٹ آیا ہے۔ انہوں نے بیوی سے پوچھا کہ پیکٹ انہیں کون بھیج سکتا ہے؟ ان کی بیوی نے بتایا کہ پیکٹ میں کچھ کتابیں ہیں اور پیکٹ کسی نے لاہور پاکستان سے بھیجا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے متعلق بالکل بھول چکے تھے اس لئے پیکٹ کا آنا انتہائی حیران کن تھا۔ اس لئے انہوں نے کھانا کھانے کے لئے ہاتھ دھونے کی بجائے فوراً" پیکٹ کو کھولا۔ پیکٹ میں سے محمد دی پرافٹ' ٹیچنگز آف اسلام اور وفات مسیح کے بارے میں الازہر یونیورسٹی کے ریکٹر محمود شلوت کا فتویٰ اور دیگر کئی کتابچے تھے جن کو پا کر انہیں بے حد خوشی ہوئی۔ انہوں نے ان کا خوب مطالعہ کیا۔ فتویٰ میں مسیح قرآن مجید سے نہایت مستند طریق پر ثابت کیا گیا تھا اور اب انہیں عیسائیوں سے مسیح کی وفات کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے بڑا موثر ہتھیار مل گیا تھا۔ فتویٰ میں اس موضوع پر قرآن مجید سے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی اور حضرت مسیحؑ کی وفات کو حتمی طور پر ثابت کیا گیا تھا۔ اس میں رفع اور متوفیک کے معانی پر کافی تفصیل سے بحث کی گئی تھی۔ اس کتابچہ کو پڑھنے کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ اگر وہ اس بارے میں کسی مولوی کے پاس جاتے تو انہیں مزید الجھن میں ڈال دیا جاتا اور صحیح راہ سے بھٹکا دیا جاتا۔ یہ کتابیں ہمارے محترم بزرگ بابو شیخ غلام قادر صاحب مرحوم نے بھیجی تھیں جو ان دنوں مفت اشاعت کے شعبہ کے انچارج تھے۔ خدا تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اس کے بعد بابو صاحب مرحوم کے ذریعہ انہیں مزید علم اور مشکل سوالات کے جوابات ملتے رہے۔ آخر کار رزاق صاحب نے درخواست کی کہ انہیں جماعت میں داخل کر لیا جائے لیکن بابو صاحب مرحوم چاہتے تھے کہ بیعت کرنے سے پیشتر انہیں تحریک اور اس کے عقائد کے متعلق مکمل علم حاصل ہو جائے اور اس طرح انہیں مزید چھ ماہ لگ گئے حتیٰ کہ انہوں نے بیعت کر لی۔ محترم رزاق صاحب کو یہاں سے تمام سوالات کے تسلی بخش جوابات اور متعلقہ لٹریچر ملتا رہا۔ ان تمام کتب اور لٹریچر کو جو لاہور سے انہیں جاتا رہا ان کو پڑھ کر انہیں یقین کامل ہو گیا کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا جیسا کہ غیر احمدی اور

قادیانی حضرات ان کی طرف غلط منسوب کرتے ہیں اور آپ یقینی طور پر رسول اکرم صلعم کی پیشگوئی کے مطابق چودھویں صدی کے موعود مجدد تھے۔ رچرڈسن اینڈ کروڈس کمپنی میں ۲۰ سال کی ملازمت کے دوران انہیں مختلف کاموں کی انجام دہی کے لئے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں متعین کیا گیا اور اس دوران انہوں نے غیر احمدیوں اور غیر مسلموں میں نہایت اخلاص اور جذبہ کے ساتھ اسلامی تعلیمات اور تحریک احمدیت کے نظریات کی تبلیغ کی۔ پھر انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ شیخ انعام الحق صاحب مرحوم سے رابطہ قائم کریں جو ان دنوں حیدر آباد دکن ہندوستان میں مرکزی انجمن کے نمائندہ تھے۔ رزاق صاحب کو ان کی زندگی میں ان سے دو بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے ان کو درویش صفت، مخلص اور نہایت محنتی کارکن پایا جو اسلام کے لئے نہایت اخلاص اور جذبہ قربانی سے کام کر رہے تھے۔ ان کی وفات کے بعد محترم عبدالرزاق صاحب کو ہندوستان میں انجمن کا نمائندہ مقرر کر دیا گیا۔

پہلی مرتبہ عبدالرزاق صاحب ۱۹۷۷ء میں پاکستان تشریف لائے۔ اس وقت حضرت مولانا عبدالحق صاحب ودیارتھی کا انتقال ہو چکا تھا۔ انہیں شوق تھا کہ وہ مزید علم حاصل کرنے کے لئے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ اور جماعت کے دیگر ممتاز علماء اور فضلاء کی کتب کے تراجم کی بجائے ان کی اصل کتابوں کو پڑھیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اردو سیکھنی شروع کی اور اس حد تک اس زبان پر عبور حاصل کر لیا کہ انجمن کی تمام اردو کتب کو پڑھا اور تحریک کے اسلام کے متعلق نکتہ نگاہ کو بڑی اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور خدا کے فضل سے اسلام پر ہر قابل ذکر کتاب جو کہیں سے بھی شائع ہو محترم عبدالرزاق صاحب کو نہ صرف اس کا علم ہوتا ہے بلکہ انہوں نے اس کا مطالعہ بھی کیا ہوتا ہے۔

غیر مسلموں اور غیر احمدیوں سے دین کے بارے میں گفتگو کے نتیجہ میں انہیں اسلام اور عیسائیت کے بارے میں اور اسی طرح تحریک احمدیت کے موافق اور مخالف کتب جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس طرح ان کے پاس کتب کا ایک قابل قدر ذخیرہ، ایک قیمتی لائبریری کی شکل میں اکٹھا ہو گیا ہے۔ ان کتابوں کی تعداد سات ہزار سے زیادہ ہے اور ان میں کئی نایاب کتب بھی ہیں۔

جب محترم عبدالرزاق صاحب کو ہندوستان میں مرکز کی طرف سے نمائندہ بنا دیا گیا تو انہوں نے تحریک احمدیت کے متعلق قادیانی عقائد کے خلاف چھوٹے چھوٹے کتابچے شائع کرنے شروع کئے۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے ایک ہفت روزہ اخبار "الحکم" بھی شروع کیا لیکن کچھ عرصہ بعد اس میں ایک مضمون "حضرت اسماعیلؑ کی قربانی حضرت عیسیٰؑ کی قربانی سے افضل" تھی پر مہاراشٹر کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے قانونی نوٹس آگیا۔ وہ چاہتے تھے کہ عبدالرزاق صاحب بلا مشروط معافی نامہ شائع کریں۔ لیکن محترم عبدالرزاق صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس میں کسی طرح بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عزت اور احترام پر اعتراض نہیں کیا گیا لیکن بات نہ بنی۔ کیونکہ عبدالرزاق صاحب تن تنہا اس کام کو کر رہے تھے۔ خط و کتابت اور لٹریچر کی اشاعت کا کام ہی کافی زیادہ تھا اس لئے انہوں نے محسوس کیا کہ ہوم ڈیپارٹمنٹ کی عدالتی کارروائی کے لئے وقت اور اخراجات برداشت کرنا ممکن نہ ہو گا اس لئے وہ رسالہ بند کر دیا گیا۔

۱۹۸۶ء میں جارج ٹاؤن گیانا (جنوبی امریکہ) میں جماعت کی شاندار جامع کے افتتاح کے موقع پر محترم عبدالرزاق صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ دنیا کے مختلف ممالک کے دورے پر نکلے۔ جامع کے افتتاحی تقریبات میں شرکت کے بعد جس کا گیانا کے صدر نے افتتاح کیا۔ محترم رزاق صاحب نے سرینام۔ امریکہ میں ہیورڈ، اوکلینڈ اور نیویارک۔ کینیڈا میں انٹاریو اور وینکور اور اسی طرح ہالینڈ میں مختلف شہروں میں جماعتوں کے دورے کئے۔ کتب کی طباعت اور اشاعت کے سلسلہ میں انہوں نے ۱۹۹۰ء میں بینکاک اور سنگاپور کے بھی چکر لگائے۔ اب تک آپ پاکستان نو مرتبہ آچکے ہیں۔ ۱۹۹۴ء سے محترم شوکت علی صاحب کے ساتھ ہندوستان میں دہلی، مدراس اور کلکتہ میں جماعت کی شاخیں قائم کرنے اور قرآن مجید کے ہندوستان کی اہم زبانوں میں تراجم کے کام میں کوشاں ہیں۔

محترم عبدالرزاق صاحب نے ادارہ دارالاشاعت کتب اسلامیہ کے ذریعہ مرکزی انجمن کی بہت سی اردو اور انگریزی کتب اور کتابچے شائع کئے ہیں اور بڑے پیمانے پر ان کی اشاعت کی ہے۔ اس کی تفصیل آئندہ کسی اشاعت میں دی جائے گی۔

شیخ محمد عبداللہ کی کتاب "آتش چنار" سے ایک اقتباس

احرار اور قادیانیوں کی کشمکش

"...... پتھر مسجد' سرینگر کے قلب میں دریائے جہلم کے کنارے خاص تراشے ہوئے کشمیری پتھروں سے بنائی گئی ایک شاندار عمارت ہے جس کو جہانگیر کی مشہور ملکہ نور جہاں بیگم نے تعمیر کیا۔ کشمیر میں بدھ اور ہندو حکمرانوں نے پتھر سے بہت سے شاندار معبد تعمیر کئے۔ جن کے کھنڈر آج بھی اپنے معماروں کی چابکدستی اور کاریگری کے گواہ ہیں لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد عمارتوں میں چوب کاری کا رجحان بڑھ گیا۔ مسلمانوں نے کشمیر میں لکڑی کا پہلا پل بھی تعمیر کیا۔ اس سے پہلے کشتیوں کو جوڑ کر عارضی پل تیار کئے جاتے تھے۔ بہرکیف پتھر مسجد' جسے شاہی مسجد بھی کہا جاتا ہے کشمیر میں مسلمانوں کی پہلی عبادت گاہ ہے جو سب کی سب پتھروں سے بنائی گئی تھیں لیکن یہ مسجد اپنی تعمیر کے بعد بہت دنوں تک نماز کے لئے استعمال نہیں کی جاتی تھی...

ڈوگرہ حکومت نے اس کو ایک سو سال سے زیادہ عرصے کے بعد واگذار کیا تو مسلمانوں نے اسے اپنی نجات کی پہلی کرن سے تعبیر کیا۔ اس دن سارے شہر میں چراغاں ہوا اور مسجد کے احاطے میں ایک بھاری عوامی جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے کی صدارت خواجہ سعدالدین شال نے کی اور میرے علاوہ اس میں سید میرک شاہ اندرابی' مولوی عبداللہ وکیل وغیرہ نے تقریریں کیں۔ بہت جلد اس مقام کو ہماری سیاسی تحریک کے دل کی حیثیت اختیار کرلینا تھی اور یہیں پر مجاہد منزل کی تعمیر شروع ہونے والی تھی۔

ادھر ہم اپنے اندرونی مسائل میں الجھے ہوئے تھے' ادھر سارے ہندوستان اور خاص طور پر پنجاب کے مسلمانوں میں اپنے کشمیری برادران ملت کی ممکنہ امداد کے متعلق اضطراب پیدا ہو رہا تھا۔ ہم بھی اس وقت مناسب مدد کے انتظار اور استقبال میں تھے۔ آل انڈیا مجلس احرار نے ہماری مصیبت کو اپنی سیاسی دکان کی رونق بڑھانے کا اچھا موقع خیال کیا۔ اس جماعت کی بنیاد چوہدری افضل حق اور ہندوستانی مسلمانوں کے چند سرکردہ عالم رہنماؤں نے ڈالی تھی۔ یہ اصحاب انڈین نیشنل کانگریس سے مختلف اختلافات کی بناء پر علیحدہ ہو گئے تھے۔ مگر ان کو آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاست سے بھی کوئی علاقہ نہ تھا بلکہ یہ اس کو مسلمانان ہند کے مفادات کے لئے سم قاتل خیال کرتے تھے۔ مجلس کی صفوں میں رئیس الاحرار سید عطاء اللہ شاہ بخاری' مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی' مولانا داؤد غزنوی امرتسری' مولانا مظہر علی اظہر' شیخ حسام الدین امرتسری جیسے مشاہیر موجود تھے اور وہی اس جماعت کے روح رواں تھے۔ مجلس اپنے رہنماؤں کی امتیازی حیثیت کے اعتبار سے کافی اہمیت رکھتی تھی لیکن مجلس نے شہید گنج لاہور کے معاملے کے متعلق جو روش اختیار کی تھی اس کی بناء پر اس کی شہرت کو دھکا لگا تھا۔ اب مجلس کے اکابر تحریک کشمیر سے وابستگی ظاہر کرکے اس دھبے کو دور کرنا چاہتے تھے۔ ان کا ایک وفد راجہ ہری کرشن کول کی دعوت پر کشمیر آیا اور سرینگر میں راجہ صاحب کی کوٹھی کے نزدیک لال منڈی میں سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے ایک سجے سجائے ہاؤس بوٹ میں قیام پذیر ہوا۔ راجہ صاحب کے ساتھ ان کی کئی نجی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں میں کیا کھچڑی پکتی رہی اس کا تو علم نہیں ہو سکا لیکن شہر میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ راجہ صاحب کے ساتھ سودے بازی ہو رہی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ پنجاب میں کشمیر کے معاملے پر حکومت کے خلاف جو آگ لگی ہوئی تھی مجلس احرار اس پر پانی ڈالنے کے لئے اپنی خدمات کسی خطیر رقم کے عوض پیش کرنے پر بھی آمادہ تھی۔ مجلس احرار کو مالی وسائل کی بڑی ضرورت تھی۔ ان کا مقابلہ ایک طرف تو مسلم لیگ کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے تھا۔ دوسرے علامہ عنایت اللہ مشرقی کی مجلس خاکساراں بھی ان پر بازی

لے جا رہی تھی۔ وہ روپے کا ایندھن ڈال کر اپنی جماعت کا انجن چالو کرنا چاہتے تھے اور تمام ہندوستان میں پھیل جانا چاہتے تھے۔ ادھر کشمیر میں راجہ صاحب نے تجوریوں کے منہ کھول دیئے تھے۔ اس لئے ہر ضرورت مند طالع آزمائی کے لئے سرینگر پہنچ رہا تھا۔ میری ملاقات وفد کے ممبروں سے ان کے ہاؤس بوٹ میں ہوئی۔ میں نے منہ پھٹ بن کر گلہ کیا کہ ان جیسے اکابرین ملت نے کس طرح سرکاری دعوت پر کشمیر آنا اور پھر حکومت کے لقمے توڑنا گوارا کیا۔ یہی حکومت ایک طرف تو ان کو ضیافتیں کھلا رہی ہے اور دوسری طرف کشمیری مسلمانوں کے خون کی پیاسی بنی ہوئی ہے۔ میں نے اپنے احراری کرم فرماؤں کو بتایا کہ آپ نے راجہ ہری کرشن کول کا مہمان بن کر غلطی کی ہے' عوام کے مہمان بنتے تو آپ کو اس قدر آرام و آسائش حاصل نہ ہوتی لیکن ان کی میزبانی قبول کر کے آپ ان مظلوموں کو جو نفسیاتی سہارا دیتے' اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ وفد کے لیڈر چودھری افضل حق نے میری اس تلخ گوئی پر تیوری چڑھائی اور پھر اپنے زور کلام سے سرکاری مہمان بننے کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن میرا دل نہ مانا۔ عوام میں بھی وفد کی نسبت بدگمانیاں بڑھتی ہی گئیں۔ بہرکیف سرینگر میں ہفتہ دس دن گذارنے کے بعد مجلس احرار کے یہ نمائندے واپس چلے گئے۔

میری دوسری گرفتاری کے بعد اکتوبر' نومبر ۱۹۳۱ء میں مجلس احرار کا یہ وفد پھر سرینگر آیا۔ بدقسمتی سے اس بار بھی وہ سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے ہی آئے اور ان کے قیام و طعام کا انتظام پھر سرکار کے ذریعے سے ہی کیا گیا۔ البتہ اب کی بار ان کا ہاؤس بوٹ دریا کے شمالی کنارے عدالت سے ذرا دور آبی گزر گھاٹ پر لنگرانداز کر دیا گیا۔ وفد کے ارکان اپنے اوقات کا زیادہ حصہ راجہ ہری کرشن کول کے ساتھ راز و نیاز میں ہی صرف کر دیتے تھے۔ اس طرح سے عوام ان کو اپنے ہمدردوں میں شمار نہ کرنے لگے اور انہوں نے وفد کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ چنانچہ جب میں ایک بار ان سے ملنے کے لئے گیا تو وفد کے ارکان نے شکوہ کیا کہ "جہاں کشمیر کمیٹی کے نمائندوں کے پاس عام لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے وہاں ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔" میں نے جواب دیا کہ "قصور آپ کا اپنا ہے۔ آپ پہلی بار سرکاری مہمان بن کر آئے تو آپ کو علم ہے کہ یہاں لوگوں پر اس کا ایک اثر ہوا۔ پھر آپ کے ہوتے ہوئے سرکار نے یہاں کے مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی اور آپ بدستور اس کی بانہوں میں بانہیں حمائل کرتے رہے۔ آپ کو تو شہیدوں کے گھر جا کر زبانی ہمدردی کرنے کا خیال بھی نہ آیا۔ حالانکہ سرکاری موٹریں آپ کے انتظار میں کھڑی رہتی تھیں۔ آپ نے حالات کا چشم دید مشاہدہ کرنے کے لئے معمولی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ اب آپ پھر سرکاری مہمان ہیں اور ہاؤس بوٹوں میں سرکاری دسترخوان کے چٹخارے لے رہے ہیں تو بھلا عوام آپ کے پاس آئیں تو کیوں؟ حکومت کی گولیوں سے ان کے بے گناہ سینے چھلنی ہو چکے ہیں۔ سرکاری تازیانوں نے ان کے جسم کی کھالیں ادھیڑ دی ہیں۔ انہیں بھانت بھانت کے فرضی مقدمات میں ماخوذ کر کے پریشان کیا جا رہا ہے۔ انہیں علاج و معالجے کے لئے پیسے کی ضرورت ہے ماہرانہ قانونی مشورے کی ضرورت ہے۔ آپ ان ضروریات میں کہیں ان کی دست گیری نہیں کر رہے ہیں۔ مگر کشمیر کمیٹی اپنے خرچے پر وکلاء بھیج کر ان کی امداد کر رہی ہے۔ ڈلٹن کمیشن کے سامنے اگر کشمیری مسلمان اپنا کیس پیش کر سکے تو کشمیر کمیٹی کی ہی امداد سے۔ اتنا ہی نہیں' کشمیر کمیٹی کے نمائندے شہداء اور قیدیوں کے گھروں میں جا کر اپنی بساط کے مطابق نقد و جنس سے ان کا بوجھ ہلکا کر رہے ہیں۔ اس لئے اگر وہ آپ کے دیوان خانے کو بھول کر کشمیر کمیٹی کے نمائندوں کا دامن پکڑ لیں تو اس میں اچنبھے کیا بات کی ہے؟ ع

کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

میرے ان دلائل کا احرار حضرات کے پاس جواب نہ تھا اس لئے مذاق مذاق میں بات کو ٹال گئے لیکن جب وہ لاہور واپس پہنچے تو وہاں ان سے پوچھا گیا کہ آپ کشمیر میں رہ کر کیا کر آئے ہیں اور آپ نے وہاں کے عوام کے لئے کیا کیا ہے؟ اس کا جواب بھلا وہ کیا دیتے۔ لگے بغلیں جھانکنے لیکن اپنی کوتاہیوں اور کوتاہ بینی پر پردہ ڈالنے کے لئے انہوں نے یہ کہانی گھڑ لی کہ شیخ محمد عبداللہ احمدی بن گیا ہے اور وہاں اب سنگین مسئلہ اسی کا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے ان ہی دنوں مسلم نمائندگان مہاراجے کے سامنے اپنے مطالبات کو پیش کرنے کے لئے ایک عرض

داشت مرتب کر رہے تھے۔ مجلس احرار کی سیاسی لائن نمائندگان کے اجلاس میں زیر بحث آئی اور مسترد ہو گئی۔ اس کے مقابلے میں یہ عرض داشت کشمیر کمیٹی کے نظریات سے زیادہ ہم آہنگ تھی۔ احراری حضرات اس بات سے بدک گئے اور لاہور جا کر انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ ہم قادیانیوں کے اثر میں ہیں اور کشمیر کمیٹی کے سربراہ مرزا محمود احمد صاحب، جو احمدی فرقے کے بانی مرزا غلام احمد صاحب کے بیٹے تھے، تحریک کشمیر کو قادیانی عقیدے کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ احرار صاحبان نے اس بات پر زور دینا شروع کر دیا کہ فتنہ قادیانیت کے سد باب کے لئے کشمیر کمیٹی کو قادیانیوں سے پاک کیا جانا چاہئے اور کسی غیر قادیانی مسلمان کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سونپ دینی چاہئے۔ احراریوں نے قادیانیوں کے خلاف اپنی ساری قوت میدان میں جھونک دی اور بالآخر مرزا محمود احمد صاحب کو کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہو جانا پڑا۔ کشمیر کمیٹی کی صدارت کی پیشکش ڈاکٹر سر محمد اقبال کو کی گئی جسے انہوں نے کشمیر سے اپنے گہرے شغف اور کشمیریوں سے دلی ہمدردی کی بناء پر قبول فرمالیا۔

ذاتی طور پر مجھے مجلس احرار کی روش سے اختلاف تھا اور میں اسے کشمیری مسلمانوں کے مفادات کے لئے خطرناک سمجھتا تھا۔ کشمیری مسلمان اسی تفرقہ بازی کے شکار ہو کر کہیں کے نہ رہے تھے۔ ہم نے خدا خدا کر کے انہیں جزوی وفاداریوں کی سطح سے اوپر اٹھا کر ایک اجتماعی مقصد کے لئے جدوجہد کرنے پر آمادہ کر لیا تھا لیکن احرار کی روش سے زخموں کے ٹانکے کھلنے کا امکان پھر پیدا ہو گیا تھا۔ میں عقیدتاً احمدیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس فرقہ کے بنیادی عقائد کا نہ زیادہ علم ہی تھا اور نہ ان سے دلچسپی ہی تھی۔ میری دلچسپی تو مسلمانوں کی شیرازہ بندی کرنے سے تھی۔ تاکہ مشترکہ دشمن کا موثر طور پر مقابلہ کیا جا سکے لیکن بدقسمتی سے احرار کشمیر میں اپنی ناکامی کا سب سے بڑا کارن مجھے سمجھتے تھے۔ اس لئے مجھے اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے انہوں نے مجھے احمدی قرار دیا اور پنجاب کے مسلمانوں میں مجھے بدنام کرنے کی کافی کوشش کی گئی۔ روزنامہ "زمیندار" لاہور کے شعلہ بیان اور آتش نگار ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان ان دنوں "قادیان کی مادیان" پر زوروں سے قلم کے چابک چلا رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے احرار حضرات کی اچھی خاصی امداد کی۔ ادھر داخلی محاذ پر مولوی یوسف شاہ صاحب نے ان حالات سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ وہ کسی اور طریقے سے مجھے نیچا نہ دکھا سکے تو انہوں نے بھی مجھ پر احمدی ہونے کا الزام عائد کر دیا۔ کچھ نوجوان بھی مجلس احرار کے اثر میں آ گئے جن کی رہنمائی اندر اندر سے مولوی محمد سعید مسعودی، جن کے بارے میں آگے تفصیل سے ذکر آئے گا، کر رہے تھے۔ خود مولوی سعید کے اپنے نظریات اور طریق کار پر احراری مسلک کی گہری چھاپ تھی اور ان کے کردار کے تجزیئے میں اس امر کو بہرحال ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہئے۔

مجلس احرار نے تمام پنجاب میں کشمیر کے طلسم نما نام پر اپنی تحریک کی کافی آبیاری کی۔ احراریوں نے مظلومین کشمیر کے نام پر کافی رقومات اکٹھا کیں لیکن اس روپیہ کو کشمیر کے اندر خرچ کرنے کی بجائے اپنی تحریک کو تقویت دینے کے لئے استعمال کرتے رہے۔ البتہ اس نے کشمیریوں پر ہو رہے مظالم کی طرف دنیا کی توجہ مبذول کرنے کے لئے کچھ جتھے ریاست کے اندر ضرور بھیجے۔ چنانچہ ان کی ایک بھاری جمعیت، مولانا مظہر علی کی قیادت میں سوچیت گڑھ کی سرحد کو عبور کرتے ہوئے ریاست میں داخل ہو گئی۔ ریاستی حکومت نے طاقت کے ذریعے مزاحمت کی تو بہت سارے رضاکاروں نے جام شہادت نوش کر لیا لیکن انہوں نے ریاست میں داخل ہو کر ہی دم لیا۔ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ احرار نے سوچیت گڑھ میں صرف دو دن کے اندر اندر ایک شاندار مسجد کی تعمیر مکمل کی جو آج تک مسجد احرار کے نام سے مشہور ہے۔

یہ تو معاملے کا ایک پہلو تھا۔ بہت جلد ہم پر قادیانی حضرات کے اصل مقاصد بھی آشکار ہونے لگے۔ انہوں نے جب ہماری تحریک کی آڑ میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو عام کرنا شروع کیا تو میرے ساتھ میرے کچھ اور ساتھیوں نے اس غلط رجحان پر تشویش محسوس کی اور قادیانی حضرات مجھ سے بھی برگشتہ ہو گئے۔ میری حالت اقبال کے الفاظ میں یوں تھی کہ۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مجھے یاد ہے کہ اپنی شادی کے بعد میں جس کا ذکر آگے آئے گا' لاہور میں اپنے سسرال والوں کی کوٹھی واقع میسن روڈ میں قیام پذیر تھا کہ میں نے احمدیوں کی اس بدلتی ہوئی روش پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے ایک میٹنگ طلب کی۔ اس میں کشمیر کمیٹی کے دوسرے سربر آوردہ اشخاص کی مانند مرزا محمود احمد صاحب نے بھی شمولیت فرمائی۔ مولانا غلام رسول مہر بھی اس محفل میں شامل تھے۔ میں نے اجلاس میں اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ کشمیری مسلمانوں کی حالت زار کی سب سے بڑی وجہ ان کا آپسی تفرقہ ہے۔ کسی قومی تنظیم کی تحریک اور نصرت کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس تفرقے کو ختم کیا جائے اور تمام مکاتب خیال کے مسلمانوں کو ایک ہی محور پر جمع کیا جائے۔ اس مقصد کی کامیابی سے تحریک کشمیر کی کامیابی بھی وابستہ ہے۔ یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب ہر مکتب خیال سے وابستہ رہنما یہ طے کر لیں کہ وہ تحریک کے پلیٹ فارم کو اپنے ذیلی عقائد کی تبلیغ کی نشرگاہ نہیں بنائیں گے لیکن کچھ عرصے سے قادیانی عقیدے کے دوستوں نے اس پلیٹ فارم سے اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔ اگر اس پر روک نہ لگائی گئی تو نتائج بہت تباہ کن ہوں گے۔"

مرزا صاحب نے میری تقریر صبر و سکون کے ساتھ سنی اور پھر بولے کہ "احمدی جماعت بنیادی طور پر ایک تبلیغی جماعت ہے۔ ہم نے پہلے پہل کشمیر میں اس قسم کی سرگرمیوں پر روک لگا رکھی تھی لیکن وہ ایک عارضی مرحلہ تھا۔ ہمارے لئے مستقل طور پر اس کی پابندی کرنا اور اپنے مشن سے دستبردار ہونا ممکن نہیں ہے۔" اس پر میں نے دو ٹوک جواب دیا کہ ایسے حالات میں احمدی جماعت کے ہم خیال کارکنوں کا تحریک سے وابستہ رہنا نہ مناسب ہے اور نہ ممکن کیونکہ ان کا تحریک کا جزو بن کر تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف رہنا کانفرنس میں فرقہ واریت کے شعلے بھڑکا سکتا ہے۔ جن میں ہمارا سارا حاصل خاکستر ہو کر رہ جائے گا۔ اس دن کے بعد ہی سے احمدی جماعت کا رویہ تحریک کے ساتھ پہلے پہل تو سرد مہری کا رہا' بعد میں وہ ہماری مخالفت کرتے رہے اور آخرکار کھلم کھلا ہمارے خلاف صف آرا ہو گئے۔ ہماری تحریک سے مولوی عبداللہ وکیل' خواجہ غلام نبی گلکار اور دوسرے کچھ اہم ساتھیوں کی علیحدگی کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ خواجہ غلام نبی گلکار کی علیحدگی تو ذاتی طور پر میرے لئے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ وہ میرے ہم سن تھے اور میرے اولین رفیقوں میں سے ایک پڑھے لکھے بھی تھے لیکن اس سے بڑھ کر یہ کہ بڑے باہمت' حوصلہ مند اور جری تھے۔ تھے تو بڑے پر خلوص لیکن قادیانی عقیدے کی وجہ سے سیاسی مسائل پر ان کی ہی رہنمائی قبول کرتے تھے۔ ان کو قوم کی زبوں حالی کا بڑا احساس تھا اور ان کا زرخیز دماغ لمبی چوڑی اور دوراز کار سکیموں کا تانا بانا بنتا رہتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ پاکستان چلے گئے لیکن وہاں بھی اپنے وطن مالوف (کشمیر) کے متعلق حکومت پاکستان کی پالیسی سے نالاں رہے۔ وہ جموں و کشمیر کے لئے مکمل آزادی کو بہترین حل سمجھتے تھے۔ آخرکار یہ سرفروش محب وطن اپنے دل میں کشمیر کی یاد بسائے پاکستان میں ہی راہی ملک بقا ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا جسد خاکی لحد میں بھی مادر کشمیر کے آنچل میں پہنچنے کے لئے بے قرار ہو گا۔

احمدیوں کے ساتھ کنارہ کشی کے سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے جس سے ان کی روش کا اندازہ ہو سکے گا۔ ایک بار ہمیں جماعت احمدیہ نے کسی تقریب کے سلسلے میں بڑے اصرار سے قادیان بلایا۔ ان دنوں زین العابدین صاحب ان کے امور خارجہ کے نگران تھے۔ ہم ان کے مہمان تھے۔ ایک بار باتوں باتوں میں انہوں نے کہا کہ غیر احمدی تو احمدی امام کے پیچھے نماز ادا کر سکتے ہیں لیکن احمدیوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھیں۔ میں نے جب وجہ جاننا چاہی تو وہ کچھ رازداری کے سے لہجے میں بولے کہ احمدی مرزا غلام احمد صاحب کو بھی نبی مانتے ہیں اور جو ان پر ایمان نہ لائے اسے خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔ ان حالات میں ہم کیسے کسی غیر احمدی کے مقتدی بن سکتے ہیں؟ ان کی اس صاف گوئی سے میری آنکھوں پر سے پردہ ساہٹ گیا اور ان کی نیت اور حکمت عملی کا سارا راز فاش ہو گیا ظاہر ہے کہ ہمارے درمیان راستوں کی علیحدگی ٹالی نہیں جا سکتی تھی۔" (ص ص ۱۳۶۔۱۴۷)

صرف کیا جائے جہاں لوگوں تک پہنچنا نسبتاً آسان ہو۔ ان شکوک و شبہات کے باوجود حضرت ڈاکٹر سعید احمد خاں صاحب مرحوم کی حوصلہ افزائی اور دعا سے اس ترجمہ کے کام کو شروع کر دیا گیا۔ حضرت امیر مرحوم کی دعائیں رنگ لائیں اور محترمہ بہن ثمینہ ساہو خان کو ایک قابل مترجم ڈاکٹر الیگزانڈر ساڈسکی مل گیا جو امریکہ میں مونٹریال اور میک گل یونیورسٹی میں روسی زبان کے پروفیسر تھے۔ ہم نہ صرف ڈاکٹر ساڈسکی کی علمی قابلیت سے متاثر ہوئے بلکہ ان کے اخلاص اور کردار نے بھی ہمیں بے حد متاثر کیا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب موصوف **کوئیبک**، کینیڈا میں لاوال یونیورسٹی میں روسی مطالعہ کے شعبہ کے ڈائریکٹر ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری نظر میں ان کی قدر و منزلت بڑھتی گئی۔

یہ ترجمہ کام سے لگن کا شاندار مظاہرہ ہے۔ مترجم نے کئی مرتبہ اس ترجمہ کی تصحیح کی ہے۔ اس مشکل کام میں ڈاکٹر ساڈسکی کی مدد ان کی نہایت ذہین بیوی ڈاکٹر تانیہ ساڈسکی اور ان کی والدہ آیدہ ساڈسکی نے کی۔ ترجمہ مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف اپنی والدہ کے ہمراہ کولمبس تشریف لائے اور محترمہ ثمینہ بہن اور میرے ساتھ بیٹھ کر حرف بہ حرف ترجمہ کو چیک کیا۔ اس مرحلہ پر ہم نے محترم نصیر احمد فاروقی صاحب مرحوم کے ان مقرر کردہ رہنما اصولوں سے پوری رہنمائی حاصل کی جو انہوں نے ہسپانوی زبان میں قرآن مجید کے ترجمہ کو چیک کرتے وقت وضع کئے تھے اور جن رہنما اصولوں کو جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں تراجم کو چیک کرتے وقت مدنظر رکھا گیا۔ محترم نصیر احمد فاروقی صاحب مرحوم قرآن مجید کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے اور سالہا سال انہوں نے درس قرآن مجید دیا۔ یہ رہنما اصول ان کی زندگی کے علم و فہم کا نچوڑ ہیں۔

جب سے روسی زبان میں قرآن مجید کا کام شروع ہوا اس علاقہ میں انقلابی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ سوویت یونین ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔ اشتراکیت اپنے ان قوانین کے ساتھ جن کا مقصد مذہب کو ختم کرنا تھا اور جو قرآن مجید کی اشاعت کے راہ میں گویا رکاوٹ کے پہاڑ تھے دنیا کے اس حصہ میں ان کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے۔ اس پیش لفظ کے راقم کو یقین ہے کہ جب ڈاکٹر ساڈسکی نے ۱۹۸۹ء میں ترجمہ کرنے کے لئے قلم اٹھایا تھا اور قرآن مجید کی پہلی آیت **بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم** کا ترجمہ کیا تھا اسی لمحہ سوویت یونین اور اس کی مذہب کے خلاف سرگرمیاں کے متعلق خدا نے فیصلہ کر دیا ہو گا۔ جیساکہ قرآن مجید میں آتا ہے: "اور اگر قرآن ایسا ہوتا جس سے پہاڑ دور کر دیئے جائیں" (رعد ۱۳:۳۱)

پاکستان سے محترم میاں عمر فاروق صاحب اور امریکہ سے محترم ڈاکٹر عبداللہ جان صاحب نے اس ترجمہ اور اس کی تصحیح کے اخراجات کے لئے گرانقدر عطیہ جات مرحمت فرمائے۔ کمپوزنگ اور طباعت کے اخراجات امریکہ جماعت نے برداشت کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام لوگوں کو جنہوں نے اس ترجمہ کے لئے عطیہ جات دیئے ہیں جزا دے اور انہیں اپنے کرم اور فضل سے نوازے۔

آخر میں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس ترجمہ کے لئے محترمہ بہن ثمینہ ساہو خان کی بے انتہا محنت، کوشش اور قربانی اور بے لوث خدمات کا بطور خاص ذکر کروں جو انہوں نے ان سات سالوں میں مترجم، تصحیح کنندگان، طبع کرنے والے اشاعتی ادارے اور دیگر امور کے انتظام و انصرام کے سلسلہ سرانجام دیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے مشکل حالات میں نہایت دانشمندی، صبر اور حوصلہ کا ثبوت دیا۔ میں اس بات کا گواہ ہوں کہ تراجم کے جلد مکمل کرانے کے سلسلہ میں ان پر بے انتہا دباؤ اور ذمہ داری کا بوجھ رہا ہے۔ لیکن ان مشکلات کے باوجود انہوں نے تراجم کے اس کام کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا ہے۔ محترمہ ثمینہ بہن نے اس پورے قرآن مجید کے عربی متن کو ترجمہ کے سامنے چسپاں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس نیک اور محنت طلب کام کا اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

قرآن مجید کے تراجم کے کام کے لئے ہمیں ہمیشہ حضرت امیر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب مرحوم کی روحانی قوت کا سہارا حاصل رہا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

حضرت امیر مرحوم کی دعاؤں، حوصلہ افزائی، مشورہ اور تحریک کے بغیر یہ سب کچھ ممکن نہ تھا۔ اس انتہائی پاکباز اور خدا رسیدہ شخص کی

دعاؤں کے نتیجہ میں یہ بابرکت کام پایہ تکمیل کو پہنچا جس نے خود حضرت مسیح موعود کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور پھر بیعت کی دوسری شرائط کے علاوہ "دین کو دنیا پر مقدم کرنے" کی شرط کو نہایت اخلاص اور جذبہ قربانی سے پورا کیا۔ آخری مرتبہ جب بہن ثمینہ ساہو خان حضرت امیر مرحوم کی عیادت کے لئے ہسپتال گئیں تو حضرت امیر مرحوم کے بیٹے ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب نے انہیں بتایا کہ محترمہ ثمینہ بہن روسی زبان میں قرآن مجید کے ترجمہ کے کمپوز شدہ صفحات اپنے ساتھ لائیں ہیں تو آپ نے بار بار **الحمد للہ** فرمایا۔ ان الفاظ کے ساتھ میں اور اس ترجمہ کے ناشرین ان تمام لوگوں کا جو کسی رنگ میں بھی اس عظیم الشان کامیابی میں مد و معاون رہے ہیں شکر گذار ہیں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے اور اجر عظیم عطا فرمائے۔ ــــ نعمان الٰہی ملک

پیش لفظ از مترجم ڈاکٹر الیگزانڈر سڈ سکی

حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم و مغفور کا انگریزی میں ترجمہ تحریک احمدیت کا اسلام کے بارے میں نہایت منفرد تحقیقی کام ہے جو ساری دنیا میں مقبول ہے۔ اس ترجمہ اور تفسیر کی شہرت انگریزی جاننے والے ممالک کی سرحدوں کو پار کر چکا ہے۔ دنیا کی زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں اس کے تراجم کے ذریعہ اب مختلف براعظم، مختلف تمدن اور مختلف مذہبی روایات کے حامل لوگ بھی حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم کے علم اور فہم قرآن سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ ہسپانوی، فرانسیسی، جرمن اور چینی زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ مجھے اس کام میں شریک ہونے کا موقع ملا۔

محمد علی مرحوم و مغفور کے انگریزی ترجمہ میں رواداری اور عقلی رجحان ہر جگہ کار فرما نظر آتا ہے اس ترجمہ میں انسانیت کے بنیادی اور اعلیٰ اقدار کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اب یہ قرآنی علم اور رہنمائی کا خزانہ روسی زبان میں بھی لوگوں کو مہیا ہو گیا ہے۔

ہمارے دور میں تحکم اور تشدد کے ذریعہ افہام و تفہیم کی روح کو دبایا جاتا ہے۔ جیسا کہ کچھ صدیاں پہلے ہوتا تھا۔ دوسرے کو سمجھنے اور اس کے نکتہ نگاہ کو سننے کو بے سود اور غیر ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس حوالے سے حضرت مولانا محمد علی صاحب کا ترجمہ اور تفسیر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے ترجمہ، تفسیر اور دیباچہ میں یہ خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے کہ اس میں اسلام کے اہم پہلوؤں اور اس کی تعلیم کا تجزیہ تاریخ اور موجودہ دور کے مسائل کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

روسی ترجمہ میں اصل متن کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ عربی الفاظ کو جس طرح وہ اصل میں ادا کئے جاتے ہیں ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح روسی ترجمہ میں لفظی ترجمہ اور جدید محاورہ دونوں کے امتزاج کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے یعنی حضرت مولانا کے ترجمہ، تفسیر اور ان بے شمار حوالے جن کا اس میں ذکر کیا گیا ہے کو روسی زبان میں ترجمہ کرتے وقت الفاظ کے انتخاب اور مفہوم کی ادائیگی دونوں میں اصل سے حتی الوسع اعراض نہیں کیا گیا۔

میں یہاں اس بات پر زور دوں گا کہ قرآن مجید کا روسی زبان میں یہ ترجمہ کرنا ہمارے لئے ممکن نہ ہوتا اگر ہمیں فلسفہ اور اسلامی تاریخ کے کئی اہم ماہرین، روسی تمدن کے کئی محقق، گذشتہ روسی تراجم اور ان کی خصوصیات کا تقابلی مطالعہ کرنے والے سکالر اور پھر مشرقی زبانوں سے انگریزی اور انگریزی سے مشرقی زبانوں میں تراجم کے ماہرین اور زباندانوں کا تعاون حاصل نہ ہوتا اور ان سے مختلف مشکل مقامات کے بارے میں تبادلہ خیالات کرنے کا موقع نہ ملتا۔

میں لاہور احمدیہ تحریک کے ممبران محترمہ بیگم ثمینہ ساہو خان اور ڈاکٹر نعمان الٰہی ملک کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اس سلسلہ میں وسیع مطالعاتی مواد فراہم کیا اور کئی غیر معمولی مشکل مراحل پر نہایت کھلے دل، مہربانی، انتہائی صبر، بے نفسی اور ایثار کا مظاہرہ کیا اور میرے لئے ان نیک مقاصد کی ایک اعلیٰ مثال ثابت ہوئے جن کی نشاندہی اس ممتاز مسلمان عالم دین نے اپنے انگریزی ترجمہ میں کی ہے۔ اپنے کام میں ان لوگوں کا قابل رشک انہماک اور اس کام کی اہمیت کا احساس ہر لحہ ان کو کام میں مگن رکھتا تھا۔ میرے لئے یہ عزت کا باعث ہے کہ مجھے ایسے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔